کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:16 Issue:5 May 2023

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



رمضان میں ہوئی تربیت کو فزوں تر بنایئے

از: مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورة ال عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو۔

توضیح: رمضان کا مبارک مہینہ اپنے تزک و احتشام کے ساتھ جلوہ گر ہوا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ختم بھی ہو گیا، اس کی رحمتوں، مغفرتوں، برکتوں، سعادتوں سے جو جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا اس نے اٹھایا، یہ ایک انقلابی، روحانی، تربیتی مہینہ تھا اس کے ماحول میں عبادتیں، خیراتیں، آہیں، سسکیاں، بے تابیاں تھیں، جلوتوں میں اجتماعی عبادتیں، خلوتوں میں راز و نیاز، آہ و زاریاں تھیں، خدا ترسی کے اس ماحول کو دیکھ کر کچھ نہ سہی کم از کم دل پسیج جایا تو کرتا تھا اور کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا تھا، یہ اس مربی کامل، منقلب القلوب ذات وحدہ لاشریک کی جانب سے تربیت کا ایک غیبی نظام تھا، جس نے جتنی ریاضات و محنت کی وہ اتنا ہی کامیاب رہا، جس نے جتنی نا قدری کی اس نے اپنا ہی کچھ نقصان کیا، دینے والی ذات تو نہ صرف منتظر بلکہ ندا لگا رہی تھی کہ دربار عام و خاص لگا ہے، اذن عام ہے مانگو ملے گا، فریاد کرو پوری کی جائے گی۔

ہم میں سے جس کو جس قدر رمضان کے خیر میں سے حصہ ملا وہ نہ صرف اس کی حفاظت کرے بلکہ اس کو فزوں تر کرنے اور بڑھانے کی کوشش کرے اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی رسی کو جو احکامات کی شکل میں آسمان سے دنیا میں لٹکائی گئی ہے مضبوطی سے تھام لے کیوں کہ حدیث میں آیا ہے القرآن ھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض (الحدیث) یہ آسمان سے زمین کی طرف چھوڑی گئی ایک مظبوط خدائی رسی

---

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، کنڈہ مڑگو، بی بی نگر

ہے جس کو تھام کر آدمی دارین کی سعادت حاصل کرسکتا ہے اوراس کام کو اہلِ صدق وصفا یعنی اللہ والے آسان بناتے ہیں، لہذا ان کی صحبت سے اس کام کو آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

یہ دستور دنیا کا چلا آرہا ہے کہ ہراہم کام پر کسی صاحب الرائے سے مشورہ لیا جاتا ہے تاکہ اس راہ کا نشیب وفراز سہل ہوجائے، ناتجربہ کاری کا کوئی نقصان نہ ہو، جب دنیوی معاملات میں اس قدراحتیاط اوراپنے نقصان کا اس قدرخوف ہے تو پھر دینی امور میں کسی اللہ والے سے اپنا رشتہ کیوں نہیں رکھا جاتا ہے؟ کسی کو اپنا دینی مشیر کیوں نہیں بنالیا جاتا ہے؟ جواب یہی ہے کہ آدمی کے نزدیک جس چیز کی اہمیت ہوتی ہے اس کی توجہ زیادہ رہتی ہے اور وہی اس کا مقصود بھی ہوتا ہے اگر دنیا ہمارا مقصود ہے تو پھر یہ ڈرنے کا مقام ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ایسے بندہ کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے'' اگر آخرت کو مقصود بنالیا جائے تو باری تعالیٰ کا فرمان ہے ''دنیا بھی خوب دیں گے، اخروی اجر تو یقینی ہے''۔

لہذا ہم سب کے لئے یہ ضروری ہے کہ استقامت دین، استقامت اعمال کی خاطر کسی متبع سنت اللہ والے کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھیں، اسی میں خیر ہے ورنہ گمراہی کے اس دور میں کسی فتنہ کا لقمہ تر بن جائیں گے، اعمال پر مداومت تو کجا ایمان پر بقا بھی مشکل ہوجائے گا، ایسے کتنے واقعات اصحاب علم وعمل، اصحاب فضل وکمال کے ہیں جن کا علم وعمل قابل رشک جن کا فضل وکمال قابل فخر تھا ان کے عبادات ومجاہدات کو دیکھ کر بت کدوں کے راہی سوئے حرم چلے، پھر ہوا کچھ ایسا کہ اچانک توفیق خداوندی سے ایسے محروم کردیے گئے کہ اہلِ ھدایت وتوفیق کے لیے ان کی ذات مقام عبرت بن گئی۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار!**

خلاصہ یہ کہ رمضان المبارک کے تربیتی ماحول سے جو قوتِ ایمان، جوش عمل، سلامتیٔ فکر ونظر اور اعمالِ صالحہ کی توفیق وہدایت نصیب ہوئی ہے اس کو برقرار رکھنا، اوراس میں ترقی کی فکراورسعی کرتے رہنا، اوراس عظیم نعمتِ ہدایت میں کسی بھی قسم کے ضعف واضمحلال کے پیدا ہونے سے خائف وچوکنا رہنا اور بارگاہِ رب الصمد میں نیازمندانہ اس کی حفاظت وبقاء کے لئے دعائیں کرتے رہنا حقیقی معنوں میں اس کی قدردانی وشکرگذاری سمجھی جائے گی۔

اللھم یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک یا مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک۔

درسِ حدیث



دین پر جمے رہیے

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَن اَبِیْ عَمْرٍو سُفْیَانِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الثَقَفِیْ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قُلْ لِیْ فِیْ الاِسْلَامِ قَوْلًا لَاأَسْئَلُ عَنْہُ أَحَداً غَیْرِکَ، قَالَ: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ، ثُمَّ اِسْتَقِمْ (رواہ مسلم فی صحیحہ)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آپ مجھے اسلام سے متعلق ایسی بات بتلائیے کہ آپ کے بعد کسی اور سے مجھے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہو میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس بات پر ڈٹ جاؤ۔

تشریح: احادیثِ شریفہ میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے سوالات منقول ہیں کہ اُن کے جوابات بہ لحاظِ دین خود ان کے لئے اور پوری اُمت کے لئے گویا نعمتِ عظمیٰ اور ذریعۂ فلاحِ عقبیٰ ہیں، ایسے ہی مفید اور با مقصد سوالات کی فہرست میں مذکورہ بالا حدیث شریف بھی ہے کہ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ مجھے ایسی مختصر اور جامع نصیحت اسلام کے بارے میں بتلائیے کہ وہ مجھے اس طرح کافی ہوجائے اور یاد بھی رہ جائے کہ پھر کسی اور سے مجھے دریافت کرنے اور سوال کرنے کی ضرورت نہ پڑے، ظاہر بات ہے کہ اسلام کی تعلیمات واحکامات پیدائش سے لے کر موت تک، ظاہر سے لے کر باطن تک، خلوت سے لے کر جلوت تک، سر سے لے کر پیر تک، عقائد سے لے کر اخلاقیات تک بہ ہر حال پوری انسانی زندگی کو محیط ہے، اِن تمام ابواب وحصص کو نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں بیان کر دینا گویا ''دریا بہ کوزہ'' کا مصداق ہے، یہ نبوت ورسالت ہی کے شان

* استاذِ حدیث وفقہ ادارہ ہذا

کے مناسب مقام ہے جن کو اللہ پاک نے ''جوامع الکلم'' کی خوبی وکمال سے نوازا تھا، اِن صحابی کے سوال کا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے دو جامع اور مختصر لفظوں میں ایسا جواب عنایت فرمایا کہ یقیناً پھر کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رکھی، حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا: تم کہو! میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اُس پر ڈٹے رہو، ایمان چوں کہ سارے اعمالِ صالحہ کی بنیاد اور اساس ہے، اُس کے بغیر کوئی عمل عند اللہ مقبول ومعتبر نہیں ہے، اس لئے پہلے زبان سے وجودِ باری تعالیٰ کا اقرار کرو، جب دل کی تصدیق کے ساتھ زبان سے ایمان پر اظہار واقرار ہوگیا تو دوسرا کام ''استقامت'' ہے اِن ہی دونوں باتوں پر دنیوی واُخروی فوز وفلاح کا دارومدار ہے، یہی بات قرآن مجید میں اللہ پاک نے ارشاد فرمائی ہے؛ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر بیشک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اُس جنت سے خوش ہوجاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم دنیا والی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی تھے، اور آخرت میں بھی رہیں گے۔ اور اس جنت میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لئے ہے جس کو تمہارے دل چاہے اور اِس میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لئے ہے جسے تم منگوانا چاہو۔ (سورۂ فصلت: ۳۰-۳۱)

حدیث پاک کی تعلیم تمام مسلمانوں کے لئے ''استقامت فی الدین'' اور ''ثبات علی الحق'' ہے، ''استقامت'' کے معنیٰ سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، ''استقامت'' لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے؛ کیوں کہ معنیٰ اُس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسبِ معاش اور اُس کی آمد وصرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہٗ کی قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی زیادتی ہوجائے تو ''اسقامت'' باقی نہیں رہتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''استقامت'' ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء وارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے''۔ (ملخص تفسیر معارف القرآن جلد: ۴)

اللہ پاک ہمیں مخموم دل اور صدوق زبان نصیب فرمائے۔ آمین

پیش گفتار

مدارس مقاصد سے دور ہوتے جا رہے ہیں[1]

از: مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وبہٖ نستعین، وصلی اللہ علی النبی الامین

طلبہ پہلے مدارس میں تربیت کیئے جاتے تھے، ان کی شخصی زندگی تو تدیُّن ،تقویٰ اور خوف وخشیت اور زہد وقناعت جیسی صفات سے متصف ہو ہی جاتی تھی ، ساتھ ہی اُمت مسلمہ کی تعلیم وتربیت اور صلاح وفلاح کے لئے جد وجہد اور ایثار وقربانی کے جذبات سے بھی قلوب معمور ہوجاتے تھے ،گویا روشن ضمیری بلند اخلاقی اور بیدار مغزی سب کمالات سے آراستہ ہوجاتے تھے، وہ جب فارغ ہوکر جاتے تو چند ایک کو چھوڑ کر بقیہ سب ہی فضلاء خدمتِ دین کے لئے تیار اور اپنے بڑوں کے حکم واشارے کے منتظر رہتے تھے، جہاں لگا دیا جاتا اور جس جگہ بٹھا دیا جاتا صلاحیتیں تو کیا اپنی عمریں بھی وہیں کھپا دیتے تھے، ملت کے عقائد کی درستگی ، اعمال کی پختگی اور رسوم ورواج کے بہ جائے شریعت وسنت سے وابستگی کے لئے دن رات ایک کردیتے اور اس راہ کی ہر مخالفہ و مجاہدہ اور معاشی ابتلاء وآزمائش سے بے پرواہ ہوکر مدارس کے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے امُّ المدارس کے قیام کے بعد کی سو سالہ تاریخ میں جدھر دیکھو فضلاء مدارس کے یہی مناظر نظر آتے ہیں، اس کے

---

[1] یہ ایک مضمون ہے جس میں ایک بڑے مدرسے کے ذمے دار کی حیثیت سے اور فضلاءِ مدارس کے موجودہ فکری انتشار کے حوالے سے دراصل مدرسے کے ذمے داروں کو مخاطب کیا گیا ہے، بالخصوص بڑے مدرسوں کے ذمے داروں کو اپنی تشویش کے اظہار کے لئے اپنے تجربات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مجموعی اعتبار سے نہ مدارس کے منافع سے انکار ہے نہ دیگر تحریکوں کے مفید کاموں سے اختلاف ،فضلاءِ مدارس کے انتشار کو واضح کرنے کے لئے معاصر تحریکوں کا جو ذکر ضروری تھا وہ کیا گیا بس۔ اسی نکتے کو ملحوظ رکھ کر اس تحریر کو پڑھا جائے کہ فضلاءِ مدارس اور علماء کرام خود ایک مستقل جماعت ہیں اُنہیں اپنے بڑوں کے مشورے سے اور اُمت کے غم میں ڈوب کر عالم بننے کے حقیقی مقاصد پر مستقیم رہنا چاہیئے اور خود مدارس کو چاہیئے کہ طلبہ کو اسی جذبہ جہد وایثار پر تیار کریں۔

بعد تعلیم وتربیت کے معیار میں قدرے تنزل دکھائی دیتا ہے، ادھر پچیس تیس سال کے دوران قابلِ فکر حد تک مقاصد کی بصیرت کے حوالے سے مدارس میں خاصا اضمحلال پیدا ہو گیا ہے۔

گذشتہ چند دہائیوں میں مدارسِ دینیہ میں نیچے سے لے کر اُوپر تک تربیتِ نفس اور صحبتِ اکابر سے محروم اساتذہ کی کثرت ہونے لگی جو باوجود علمی استعداد اور فنی کمالات کے بھی اُن کمالات سے متصف نہیں جو مدارس کے اسلاف کا شعار اور دیوبندیت کا مابہ الامتیاز تھے، عملی اعتبار سے عام دین داروں اور اُن کے درمیان کوئی خاص فاصلہ نہیں، بزرگوں سے یا تو تعلق نہیں ___ بل کہ بعضوں کو ضرورت کا اعتراف بھی نہیں ___ یا پھر برائے نام تعلق ہے، یعنی جانے آنے اور عقیدت کا اظہار کرنے پر اکتفاء ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طریقِ سلوک واحسان گھر سے خانقاہ تک پہنچنے کا طریق بن کر رہ گیا ہے، شیخ ہمارے علم کا احترام کرے تو تکمیل سلوک کا شبہ تنبیہ وتادیب کرے تو اس کے ناقص و بے تہذیب ہونے کا خطرہ!

خلاصہ یہ کہ بہ قول حضرت علی میاں ندویؒ مدارس کے انحطاط اور افسوس ناک ماحول کا سبب مدارس میں آئیڈیل شخصیات کا نہ ہونا ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ فضلاءِ مدارس میں احساسِ کم تری اور مقاصد سے بے خبری کا پیدا ہو جانا ہے، اگر چہ کہ تاہنوز مسلمان اپنے بچوں کو مدارس دینیہ میں پڑھنے کے لئے بھیج رہے ہیں لیکن ماں باپ سے زیادہ بچوں کو مادّی محرومیوں کا درد ستا رہا ہے، ابتدائی عمروں میں جس ذوق وشوق سے علم حاصل کرتے ہیں باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ علمِ دین کی عزت وعظمت کے مقابلے میں حاملینِ علوم عصریہ کی برتری اور قناعت پسندانہ زندگی کے مقابلے میں تموُّل وترفُّہ کی آرزو پیدا ہوتی جا رہی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ فکر ونظر کی تربیت نہ ہونے اور دینی اعتبار سے مؤثر صحبت کے نہ ملنے کی وجہ سے مدارس کی سندیں کالج کی ڈگریوں کے ساتھ جوڑ کے دیکھی جانے لگی ہیں کہ اس سند سے کتنی آمدنی ہے اور اس سے کتنی؟ ظاہر ہے کہ مدارس کی سندوں کے ذریعہ دس بارہ ہزار سے زیادہ سوچا نہیں جا سکتا جب کہ کالج کی ڈگری سے اس سے کہیں زیادہ توقعات وابستہ ہیں، چناں چہ بعض فضلاء مدارس اپنے ماں باپ سے انصاف نہ ملنے کے شکوے کرتے یا عوامُ الناس کی ناقدریوں کے مرثیے پڑھتے یا نظماء مدارس وصدورِ مساجد کے مظالم کی داستانیں بکتے نظر آ رہے ہیں، تعجب ہے کہ بعض معتبر علماء بھی دینی تعلیم وتربیت میں انحطاط کا سبب انہی چیزوں کو سمجھتے دکھائی دے رہے ہیں، حالاں کہ میرے نزدیک اگر چہ کہ نظماء وصدور کی کنجوسی؛ ذخیرہ اندوزی؛ اور خودنوازی یقیناً ناقابلِ معافی جرم ہے لیکن فضلاء مدارس کی فکر وسوچ کی مذکورہ بالا ابتری معاشی ابتری کا نتیجہ نہیں ہے، مدارس کے بدلے ہوئے ماحول اور مقاصد پر مظاہر کے غلبے کا نتیجہ ہے، کیوں کہ علماء کی معاشی صورتِ حال پہلے بھی کونسی اچھی تھی؟

لیکن فکر وسوچ کی بلندی اور عزائم ومقاصد کی برتری انہیں کبھی اس غم میں مبتلا ہونے نہیں دیتی تھی، خدا تعالیٰ نے بھی باوجود تنگی کے علماءِ سلف کو کسی ذلت وپستی میں مبتلا ہونے نہیں دیا تھا، آزمائشوں کو سہنے کا ولولہ اور راضی بہ رضا رہ کر اپنے کاموں میں مشغول رہنے کا سلیقہ عطا فرما دیا تھا جس سے ان کو آلام ومصائب کے خاروں میں کلی بن کر چٹکنا اور مسکرانا آ گیا تھا۔

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم چشم بھی میری تر نہیں
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم کسی کو اس کی خبر نہیں

اب فضلاءِ مدارس کے حالات اتنے بدل چکے اور سوچ اتنی گر چکی ہے کہ وہ ان باتوں کو قبول کرنے اور پیچھے کی طرف لوٹنے کے بہ جائے ان باتوں کا مذاق اُڑانے لگے ہیں، چند متموِّل فقہاء ومحدثین کی مثالیں دکھا کر بڑوں کو ہی بے کار کی تسلیاں نہ دینے کی نصیحت کرنے لگے ہیں، میرے خیال میں جونیئرز کی اس سوچ کی ذمہ داری بھی ہم سینئیرز کو لینی ہوگی کیوں کہ مدارس کے ماحول کو سلف کی روش سے ہٹانے کا کام دانستہ یا نادانستہ ہم نے ہی انجام دیا ہے۔ اعاذنا اللہ من اثراتہ المضرّۃ والقبیحۃ

طلبۂ مدارس کو اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ اسکولوں اور کالجوں کی طرح طلبہ مدارس بھی ابتداً تو اساتذہ سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے ہیں لیکن انتہاءً انہیں اپنا خیر خواہ سمجھنے؛ جذباتی لگاؤ رکھنے؛ اور اشاروں پر مر مٹنے کا کوئی جذبہ ان کے اندر باقی نہیں رہتا، اعمالِ نافلہ تو کجا احکامِ واجبہ میں تک کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے، فراغت کے بعد دفاع ودعوت؛ اصلاحِ اُمت، اور قوم کی خدمت کے بہ جائے معاشی استحکام اور مادّی ترقی کی فکر ذہنوں پر مستولی ہوتی جارہی ہے، یہ تو صحیح ہے کہ اسباب کے درجے میں کوئی نہ کوئی ذریعہ اپنانا لابُدی ہے ہونا بھی چاہیئے لیکن ایک عالمِ دین اور نبی کے جانشین پر جن فکروں کا غلبہ ہوا کرتا تھا اور ہونا چاہیئے تھا وہ کم یاب ہو گیا ہے، اگر امامت وتدریس ذریعۂ معاش نہ ہو سکتے تو شاید اس سے بھی دلچسپی نہ ہوتی، چناں چہ بہت سے فضلاء کو اپنی قسمت پر نادم ہوتے اور اپنے بچوں بچیوں کے لئے عصری علوم کا انتخاب کرتے اور انہیں کمپنیوں اور کارخانوں میں لگاتے اور پھر اس سے بہت خوش ہوتے فخر کرتے دیکھا جارہا ہے۔

پہلے کے مقابلے میں امتِ مسلمہ ہندیہ کو مختلف محاذوں پر قیادت وراہ نمائی کے لئے متحرّک ومخلص لوگوں کی اب بے پناہ ضرورت ہے اور وہ بہ جز علماء کے کوئی اور نہیں ہو سکتے، علماء کو متحرک مخلص وپُرعزم بنانے کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ اُن کی تربیت گاہ یعنی مدارسِ اسلامیہ کے ذمہ داروں کی ہے، اس لئے جب تک مدارس کے مؤسسین ومنتظمین کے افکار واہداف صحیح نہیں ہوں گے اُمت کو لائق ومخلص راہ نما نہیں مل سکیں گے، پھر جب

علماء قیادت کے اہل نہیں ہوں گے تو جہلاء ملت کے کاموں کو اپنی گرفت میں لے لیں گے بل کہ بہت حد تک لے بھی چکے ہیں، پھر جاہلوں کی قیادت وامارت ملت کا بیڑہ جس طرح غرق کرے گی بل کہ کر رہی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

یہ تو مدارس کے اندرونی نظام کی خرابی تھی جو مدارس میں تعلیم کے ساتھ تربیتِ افکار؛ تدریبِ عزائم واہداف؛ اور مزاجِ اکابر و مذاقِ اسلاف کی جانب مطلوب توجہ نہ دینے سے متعلق ہے، فضلاء مدارس کے حوالے ہی سے چند بیرونی مسائل ہیں، ایک تو یہ کہ برادرانِ تبلیغ، بالخصوص اُمراءِ جماعت دین کی خدمت کے لئے مدارس کی تعلیم کو کافی نہیں سمجھتے، فراغت کے بعد کم از کم ایک سال ___ اور اب تو دو دو تین تین سال لگانے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں ___ جماعت میں لگانے کو فریضۂ اسلامی کے درجے میں ضروری مانتے ہیں، فراغت سے پہلے ہی اس کا پیچھا شروع کر دیتے ہیں، اس کو اور اس کے سرپرستوں کو مجبور کرتے ہیں کہ سال لگانے سے قبل کسی کام پر نہ لگے، بل کہ کئی جگہوں پر تو سال لگائے بغیر کسی بھی دینی کام میں مشغول ہونے کو ناممکن سا بنا کے رکھ دیا گیا ہے، پھر چلو اس کو جماعت میں اس لئے نکالا جاتا کہ جہلاءِ عوام کو اس کے ذریعے سیکھنے سکھانے کا کوئی فائدہ ہو جائے گا تو پھر بھی اس کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا تھا لیکن عملی صورتِ حال جو سامنے ہے وہ یہ ہے کہ اس کے علم سے تو کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اُسے البتہ جاہل امیر کا پابند فرمان بنا کر دین اور علم دین کے جامع تصور اور عالمِ دین کی بنیادی ذمہ داریوں کا احساس اس کے دل سے نکال دیا جاتا اور اپنے اس روایتی کارِ دین کا کُل دین ہونا گھٹی میں بٹھا دیا جاتا ہے، گویا مدارس کی آٹھ سالہ محنت پر ایک سال میں پانی پھیر دیا جاتا ہے، چناں چہ سال لگانے والے بعض علماء اگر قویُ الاستعداد ہوتے ہیں تو ضابطے کی خانہ پُری کر کے لائن بدل لیتے ہیں اور اکثر جو غبی الاستعداد اور خود اعتمادی وسدادِ فکری سے عاری ہوتے ہیں وہ اسی غلوِّ عملی اور عصبیتِ جماعتی کے شکار ہو کر نہ صرف معاصر بل کہ اکابر کو بھی دین سے غافل اور نبیوں والے کام سے جاہل قرار دینے میں ذرا باک محسوس نہیں کرتے، اپنے اساتذہ ومشائخ اور مدارس وخوانق پر تک زبان طعن واعتراض دراز کرنے سے نہیں شرماتے، اپنی اس چلت پھرت اور اس کے ذریعہ ہونے والی عوامی خدمت ومحنت ___ جو اپنی جگہ ضروری بھی ہے ___ ہی کو کارِ دین اور نبیوں والا کام جتلاتے رہتے ہیں، جب کہ کسی بھی ماثور ومتوارث لائن سے دین کامل کی دعوت اور امتِ مسلمہ کی صلاح وفلاح کے لئے کی جانے والی کسی بھی سعی کو نبیوں والا کام کہا جا سکتا ہے لیکن خاص مرکز نظام الدین کی ہدایات وترتیبات والے کام کو حصر کے ساتھ کارِ دین یا نبیوں والا کام کہنا اور اس طرح کہنا کہ بقیہ اس سے بھی

زیادہ اہم کاموں کی وقعت قلوب سے نکلتی رہے بل کہ نکالی جاتی رہے یہ کسی نبی کا کام نہیں تھا، چہ جائے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے جامع وکامل داعی کا، دعوت وتبلیغ کا موجودہ نظام اور مروجہ کام ملتِ اسلامیہ میں شعور دین بیدار کرنے اور دین سیکھنے کی فکریں پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اور بلاشبہ اہم دینی کام ہے بہ شرطے کہ اسی تصور اور اسی حد میں ہو، ورنہ اس کام کے بارے میں کام میں لگے علماء وعوام دونوں میں قرآن وحدیث کی نصوص کا جس قدر سطحی استعمال کیا جارہا ہے وہ خود ایک قابلِ اصلاح ورجوع فتنہ ہے۔

دعوت وتبلیغ کا جو کام غافل و بے شعور عوام کو علماء ومشائخ سے قریب لانے کے لئے آغاز ہوا تھا وہ اب علماء ومشائخ سے بُعد وبدگمانی کا مضبوط ذریعہ بن گیا ہے، گو کہیں کم کہیں زیادہ، جو نصابِ تعلیم وتربیت دین کی بنیادی فہم اور ضروری عمل کے لئے شروع کیا گیا تھا وہ اب کمالِ دین، روحِ ایمان اور حقیقتِ دین مان لیا گیا ہے، دعوت کے اس محدود ومخصوص طریقۂ کار ہی کے دعوتِ مسنونہ اور بعثتِ انبیاء کا واحد وکامل مقصود ہونے پر اتنا اصرار کیا جارہا ہے کہ ایک بڑی تعداد کا عقیدہ بن چکا ہے اور جس کی وجہ سے دین کے تمام محاذوں اور اہم کاموں کو یا تو بے اصل یا بہ درجۂ ثانوی کردیا گیا ہے، مراکزِ علم کی بلا روک ٹوک کھلے عام تنقیص وتحقیر کی جارہی ہے، جماعت میں شامل علماء نکیر تو کیا کرتے مزید تائید کررہے ہیں، پہلے جماعت کے اکابر بھی مسائل پر گفتگو نہیں کرتے تھے، اُنہیں مسائل علماء اور اہلِ فتویٰ سے معلوم کرلینے کے لئے کہتے تھے، جماعتوں میں نکلے علماء کو بھی فضائل تک محدود رہنا سکھایا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ غیر معتبر فضائل تو بلا جھجک پھیلنے ہی لگے تھے اب مسائل ایسے ایسے سامنے آرہے ہیں جو **یأتونکم باحادیث مالم تسمعوا انتم ولا آبائکم** کا مصداق ہیں۔ گویا وہ علماء جنہیں دین کی جامعیت وکاملیت اور تمام شعبہائے دین کی اہمیت وضرورت کا سبق پڑھایا گیا تھا؛ دینِ عدل وقسط کی خوبیوں سے روشناس کرایا گیا تھا اور پورے دینِ اسلام کا داعی بنایا گیا تھا وہ سال لگانے کے بعد کسی مخصوص ومحدود اور الہامی طریقِ کار کو ــــ جو دن بہ دن اپنی اصل سے منحرف بھی ہوتا جارہا ہے ــــ منصوص سمجھنے اور ثابت کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں جب کہ ایسا کرنا بدیہی البطلان ہے، اس پر مزید یہ کہ ملفوظات کو نصوص کا اور شخصیات کو شارح کے بہ جائے شارع کا درجہ دیا جارہا ہے، قرآن وحدیث کے طبع زاد مفہوموں کو جن کے اساتذہ اور اکابر علماء غیر معتبر قرار دے رہے ہیں کام میں لگے اصاغر علماء انہی باتوں کو تجدیدی کارنامہ اور انعاماتِ ربانیہ قرار دے رہے ہیں۔

مشتے از خروارے کے طور پر ایک مقامی امیر کا ایک عالم سے یہ کہنا ہے کہ داعی کا مقام عالم سے زیادہ ہے اس لئے میں نے اپنے کسی بچے کو عالم نہیں بنایا۔ ایک مقامی امیر کا مسجد کے امام سے کہنا ہے کہ اگر مسجد میں

فضائل اعمال، فضائل صدقات اور منتخب احادیث کے علاوہ چوتھی کتاب آئے گی تو لاشیں گر جائیں گی۔ایک مقامی امیر کا امامِ مسجد سے کہنا ہے کہ جس عالم کے چار ماہ بھی نہیں لگے اس کا خاتمہ ایمان پر ہونا مشکل ہے۔ایک مقامی امیر کا عالم امامِ مسجد کے درس قرآن پر یہ تبصرہ ہے کہ مولانا درسِ قرآن بند کرو فضائل اعمال پڑھو، لوگ قرآن سے نمازی نہیں بنتے فضائل کی تعلیم سے بنتے ہیں۔ایک مقامی امیر کا کہنا ہے کہ جس طرح نماز کے لئے کعبۃ اللہ قبلہ ہے اسی طرح دعوت کے کام کا قبلہ نظام الدین ہے۔

یہ چند تازہ مثالیں ہیں ورنہ اگر ملک بھر سے علم میں آنے والی ان جاہلی اختراعات کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہوجائے اور وہ ایسی باتیں ہیں جن کی تاویل متعصب معتقدین تو کر سکتے ہیں لیکن عام مسلمان بھی ان کو صحیح نہیں سمجھ سکتا، فالی اللہ المشتکی و المستعان

نویں صدی ہجری کے آغاز میں اُٹھنے والی مہدوی تحریک کا بھی بہت ہی حسین وجمیل آغاز ہے مؤرخین اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں لیکن غالی عقیدت مندوں نے غلو ہی کے مرض میں مبتلا ہوکر اس تحریک کو دینِ اسلام کے متوازی ایک باقاعدہ دین بنا ڈالا اور اپنے مرشد و راہ نما کو مہدیٔ موعود اور ہم سرِ رسول تک کہہ ڈالا، آج سارے عالم میں اس کے قائلین موجود ہیں، کیوں کہ تحریکیں وسیع وعریض ہونے اور عوام میں پھیل جانے کے بعد قابو سے باہر ہوجاتی ہیں؛ بالخصوص وہ تحریکیں جو کسی پیشگی منصوبے اور دستور اساسی کے بغیر چل پڑتی اور پھیل جاتی ہیں، اور ان میں مؤاخذہ ونکیر کو مخالفت سمجھا جاتا ہو، چوں کہ ایسی تحریکوں میں نقل در نقل کام چلتا اور ہر چالاک آدمی اپنے کو مستقل بالذات اور بانی تحریک کا مزاج شناس قرار دے کر اپنے کو منواتا رہتا ہے۔

مہدوی تحریک کے ابتدائی داعیوں نے اپنے جہل کو علم بنانے اور اپنے ہفواتِ نفسانیہ کو مراداتِ ربانیہ کہلوانے کے لئے امام تحریک کی طرف سے یہ فلسفہ پیش کیا کہ علم لدُنّی علم ظاہری وشرعی سے اعلیٰ چیز ہے اور وہ صرف امّیوں کو دیا جاتا ہے، اور اگر کوئی پہلے سے عالمِ دین ہے تو اس کا علمِ ظاہر فراموش کر کے پھر اس کو علمِ لدنّی اور علم مرادِ الٰہی سے سرفراز کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح انہوں نے پوری چالاکی سے اپنی اختراعات ومزعومات کو شریعت کی کسوٹی پر کسے جانے سے آزاد کرالیا، جب شریعت کسوٹی نہ رہی تو زبان وقلم جہاں چاہیں بھٹکیں جو چاہیں کہیں وہ علم لدنّی کے کرشماتی سایئے کے نیچے مرادِ الٰہی اور احکامِ خداوندی بنتے چلے جائیں گے، چناں چہ ایسے ہی مفروضات نے لاکھوں مسلمانوں کو دامِ ارتداد میں پھنسالیا اور بڑی خوش فہمی اور کمالِ اعتقاد کے ساتھ پھنسالیا، اَتباع نے متبوع کی باتوں کو شریعت کی کسوٹی پر کس کے دیکھنے کے بہ جائے شریعت کو متبوع کی باتوں کا مؤید بنانے کا اُلٹا کام شروع کیا، اس کے لئے کتاب وسنت کا اس قدر جارحانہ استعمال بل کہ

استحصال کیا کہ الامان الحفیظ۔ پورا لٹریچر خرافات اور دعاویٔ محضہ سے بھرا پڑا ہے۔

دعوت وتبلیغ کے نام سے مروّج وموجود یہ مبارک تحریک ماضی میں جس کے ثمراتِ خیر سے کسی مؤرخ کو انکار نہیں ہوسکتا اور جس کے کارکنان کا اس کام سے جذباتی لگاؤ اور اس کے لئے ہر طرح کا ایثار وقربانی کسی نظر والے سے مخفی نہیں ہے، بہ ظاہر اب اسی خطرہ کی زد میں محسوس ہورہی ہے۔ میں نہ کوئی مؤرخ ہوں نہ محقق، علم اور علماء کا ادنیٰ خادم ہوں لیکن جن علماء سے دین کو سمجھا اور جانا ہوں اور تاریخِ اسلام میں سچّے داعیوں اور اچھی تحریکوں کے صراطِ مستقیم سے پھسل جانے کے اسباب میں غور کرسکا ہوں اس کی روشنی میں پوری دیانت وامانت کے ساتھ اور امتِ مسلمہ کی بہت بڑی تعداد کے حق میں خیر خواہی کرتے ہوئے کسی تعصب وعناد کے بغیر محض رضائے الٰہی کی نیت سے یہ عرض کردینا اب فریضۂ وقت سمجھتا ہوں کہ اگر فضلاء مدارس اس تحریک کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو بہ حیثیت مصلحِ افکار وانظار اس میں شامل ہوں اور اگر اس کی صلاحیت یا اس پر قدرت نہیں ہے تو محض تائید وتقویت کے لئے شامل ہونا ایک اپنی راہ سے بھٹکتی اور دین کے نام پر دین کے متوارث تصویر کو بدلتی تحریک کا ساتھ دینا ہوگا، جس کو لکھتے ہوئے قلم کانپتا اور دل دُکھی ہوتا ہے مگر اس تحریک کے اکثری احوال اور عقیدت مند کارکنوں کا انداز ___ اللہ بچائے ___ کسی نامعلوم مستقبل اور المناک انجام کی خبر دے رہا ہے۔

انہی دنوں سال لگا کر آئے ایک عالم نے بتلایا کہ بعض باتیں تعلیم کے دوران مجھے کھٹکتی تھیں اور میں ٹوکنا چاہتا تھا تو امیر صاحب کبھی کہتے ابھی تو وہ سیکھ رہا ہے ٹوکنے سے اس کی دل شکنی ہوگی اور کبھی کہتے وہ بہت پُرانے آدمی ہیں ان کے احترام کے خلاف ہوگا، یہ کیا دین ہے؟ چاہے لوگوں میں غلط باتیں پھیلتی رہیں مگر دین کے بہ جائے نفس وشخص کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ سبحان اللہ!

ایک سال میں چل رہے عالم نے چند ماہ قبل بتایا کہ ہر چلّے کے بعد اصولاً مرکز حاضر ہونا ہوتا ہے، میں تین مرتبہ حاضر ہوا اور عصر کے بعد اساتذۂ مدرسہ کی مجلس میں شرکت کیا، تینوں مرتبہ یہ بات ضرور سامنے آئی کہ اِس دور کے علماء کی اتباع درست نہیں ہے، میں نے پوچھا کہ پھر مرکز کے علماء بھی تو اِس دور کے عالم ہیں، پھر ان کی باتیں بھی کیوں سنی اور مانی جائیں؟۔ دراصل علماء سے ان لوگوں کی مراد کام میں نہیں لگے علماء ہیں، اس لئے کہ میں نے جب ایک تبلیغی نوجوان سے بستی کے عالم سے نہ ملنے اور ان سے دوسروں کو بھی استفادہ نہ کرنے دینے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے علماء ہمارے لئے کافی ہیں، دوسرے علماء کی ہمیں ضرورت نہیں، میں نے کہا کہ ہمارے تمہارے کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ جمہور علماءِ حق سے ہٹ کر کوئی مستقل فرقہ اور علاحدہ نظریہ ہیں اور آپ کے علماء بھی الگ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل ہر تحریک اپنے لوگوں کو علماء سے دور اور

بدگمان کر کے ہی اپنی تحریک کی آبرو بچا رہی ہے لیکن اس تحریک نے ایسا کرنے کے بہ جائے علماء کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا بیڑہ اُٹھایا ہوا ہے تاکہ نہ کوئی ٹوکنے والا رہے نہ حدود وقیود اور اصول کی بالادستی قائم رہ سکے۔

اس کی وجہ میرے دریافت کرنے پر ایک تبلیغی خانوادے میں پیدا ہو کر تبلیغی ماحول میں عالم بن کر پچیس سال تک اندرون و بیرونِ ملک کام کر کے اور بڑوں کے قریب پہنچ کر علاحدہ ہونے والے عالمِ دین نے جواَب بھی موجود ہیں یہ بتلائی کہ تبلیغی مراکز کا کنٹرول کہیں بھی علماء کے ہاتھ میں نہیں ہوتا تجّار اور مال داروں کے قبضے میں ہوتا ہے، علماء خواہ کام میں لگے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں، یہ جواب میری تحقیق[1] کی تصویب معلوم ہوا، واللہ اعلم!

مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فضلاء کی ایسی تربیت کریں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ سمجھ کر اس کے لئے اپنے کو وقف کر دیں، ان کا علم اُنہیں راہِ اعتدال سے نہ ہٹائے اور صحیح وسقیم میں امتیاز کرائے معروف ومنکر پر ان کی نظر ہو تاکہ وہ معروفات کی اشاعت اور منکرات کے ازالے کی فکر علی وجہ البصیرت کر سکیں، کسی بھی کام کے اُس حد تک معاون رہیں جس حد تک شریعت میں گنجائش ہو اور اپنے لئے ان کاموں کا انتخاب کریں جن کی امت کو زیادہ ضرورت ہو، علاقے اور زمانے کی ضرورتوں کو سمجھ سکیں، نہیں تو پھر عامی و عالم میں کیا فرق باقی رہ جائے گا، وہ بھی جذبات کے بندے یہ بھی خیالات وخواہشات کے پیرو! احکام کی متابعت وحفاظت کون کرے گا؟ جب کہ دین نام ہی ہے خواہشات سے نکل کر احکام کے ماتحت ہوجانے کا۔ علماء کا کام دین کے اسی مزاج کو امت میں قائم رکھنے کا ہے اگر دعوت وتبلیغ میں لگے اکثر علماء سطحی اور وضعی باتوں کو عوام کی طرح بیان کرتے اور پھیلاتے رہیں گے اور فضائل کے بیان میں قدرِ جواز پر اکتفاء نہ کریں گے، غلط بیانیوں پر روک تھام نہیں کریں گے تو پھر جہل کا یہ سلسلہ دعوت کی تحریک کو مہدویت کی تحریک ہی کی طرح ایک مستقل ومتوازی مذہب بنا کے رکھ دے گا جس کی آواز لا فعل اللہ اب آنے لگی ہے۔

دوسرا مسئلہ فضلاء کے حوالے سے یہ ہے کہ اِدھر کچھ عرصے سے فضلاء مدارس کی اس بے بصیرت صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے جماعتِ اسلامی ہند نے بھی اپنے بازوئے حمیت وہدایت اُن کے لئے کھول دئے ہیں، یہ جماعت ابتداءً وبناءً تو بہت سے علماء اپنے جلو میں لئے ہوئے تھی لیکن علماء کی اسی امتیازی شان نے کہ وہ ہر نظریئے کو اہلُ السنۃ والجماعت کے افکار کی روشنی میں بنے عقائد واصول پر رکھ کر اس نظریئے کے سداد وفساد کا فیصلہ کرتے ہیں انہیں میرِ جماعت کے افکار ونظریات سے علاحدہ کروالیا، کیوں کہ علماء اصلاً حق کے حامی وداعی ہوتے ہیں، نظریے کو اصول پر پرکھتے اور کسی شخصیت کی عظمت سے متأثر نہیں ہوتے ہیں، ان علماء کے علاحدہ

---

[1] اس تحقیق کا ماحصل کئی برس قبل میں نے مرتب کر کے رکھا ہوا ہے جسے اکابر سے تصویب کرانا باقی ہے۔

ہونے کے بعد بھی جماعت کو جامعۃ الفلاح، جامعۃ الاصلاح، اور ندوۃ العلماء سے اچھے علماء ملتے رہے جنھوں نے اس کی علمی ساکھ کو برقرار رکھا، اچھے اور اہم موضوعات پر خطاب وکتاب کا انہیں ملکہ حاصل تھا، لیکن اولُ الذکر دو مدارس کے اضمحلال سے یہ سلسلہ بھی اب نا کے درجے میں رہ گیا تو ان حضرات نے ملک کے تمام ہی جامعات کے فضلاء کو مانوس اور جماعت میں شامل کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔

ویسے تو وہ اپنے نظریات اور بانیٔ جماعت کے تأثرات کی روشنی میں مدارس سے فارغ اِن علماء کو فرسودہ خیال اور زمانے کے تقاضوں اور دعوت کے فرائض کے لئے نااہل سمجھے ہوئے تھے، بل کہ اب بھی کچھ زیادہ تبدیلی نظر نہیں آتی پھر بھی علماء کی قلت کو جماعت کے استحکام کے لئے اچھا نہ سمجھتے ہوئے چند سال قبل علماء کنونشن کا ملک گیر پیمانے پر آغاز کیا تاہم اس میں معتبر علماء کا کچھ زیادہ رجحان نہ رہا، اس کا سبب جماعت کے ٹائٹل کا استعمال تھا، پھر انھوں نے اپنے ہم خیال چند علماء کرام کو آگے کر کے وفاق العلماء کی بنیاد ڈالی جو اگرچہ جماعت ہی کی ایک شاخ ہے لیکن ایس آئی او کی طرح مستقل ایجنڈہ اور وسعتِ فکر کے ساتھ قائم کی گئی ہے۔ وفاق کے پروگرام اہتمام سے کئے جارہے ہیں اور جماعت کے کارکنان اپنے اپنے حلقوں کے علماء کو بہت ہی اکرام کے ساتھ لاکر ان میں شرکت کروا رہے ہیں، جماعت کے قائدین علماء سے متعلق ان اقدامات میں گرچہ مخلص ہوں مگر کوئی جماعت اپنے نظریے کے رنگ واثر سے خالی نہیں ہوتی، بالخصوص جس طبقے کو کل تک دقیانوس؛ تنگ نظر؛ ذہنی غلام؛ حالات وتقاضاہائے زمانہ سے بے خبر و بے بصیرت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بانیٔ جماعت نے اپنے اس طبقے میں سے نہ ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا، اس طبقے کے ساتھ یہ حمیت وہم دردی اُن سے استفادے کے لئے تو نہیں ہوسکتی اُن کی فکری اصلاح اور ذہنی غلامی سے آزادی دلانے کے لئے ہی ہوسکتی ہے۔

اپنے مراکزِ علم اور اساتذہ کرام کی سرپرستی سے آزاد اور اپنے آپ میں مستقل بالذات فضلائے مدارس کو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی اور مسلکی تصلّب کو ــــ نہ کہ تعصّب ــــ اور اسلاف واکابر کی دیانت وصداقت کو نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا، دوسری طرف آج کل مدارس میں تربیتِ افکار وصحبتِ اکابر کے فقدان نے راحت وشہرت کی ہوس بھی فضلاء کے دلوں میں برقرار رکھی ہوئی ہے، نیز اعجاب کل ذی رأی برأیه کی پیشن گوئی بھی تیزی سے عام ہوتی جارہی ہے، ان چند در چند وجوہات کی بناء فضلاءِ مدارس کی اچھی خاص تعداد ان پروگراموں کی طرف مائل اور ان میں شامل ہوتی جارہی ہے۔ یہ صورتِ حال بھی ذمہ دارانِ مدارس کے لئے لمحۂ فکریہ اور اپنے مقاصد کے حصول میں نشانِ سوالیہ ہے کہ اُن کے فضلاء بہ جائے اس کے کہ جماعت کے اندر موجود اکابر محققین اور علماء پیشین کے نشان زد کردہ بنیادی اغلاط اور اہل السنۃ والجماعت سے فکری انحراف کے

باوجود علماء ہی کی نظریاتی تنقیص وتحقیر کے اثر سے خود بچتے اوران کی اصلاح کی کوشش کرتے خود ہی اُن سے متأثر ہوتے چلے جائیں اور بالآخر اپنے بڑوں کواُن پر تنقید واختلاف میں قصوروار یا غیر ذمہ دار سمجھنے لگیں۔

میں ہرگز اس کا مخالف نہیں کہ سینئر علماء کرام جونظریات وافکار کے فرق پر نظر رکھےّ ہوئے ہیں وہ اختلاف کے حدود کوملحوظ رکھتے ہوئے قومی وملیّ ضرورتوں پر ہراس جماعت کے ساتھ دستِ تعاون بڑھائیں جو اسلام میں داخل اور مسلمانوں میں شامل ہیں، کیوں کہ ان جماعتوں سے جہاں اختلاف ہے وہیں ملت کے تئیں ان کے اچھے کاموں اور خدماتِ حسنہ سے انکار بھی نہیں ہے، پر اختلاف چوں کہ ذاتیات وشخصیات کا نہیں ہے عقیدے اور فکر سلف کے تحفظ کا ہے اس لئے اس میں تساہل وتسامح عالمِ دین کی خوبی تو کیا ہوسکتی اس کے دین پر بدترین داغ اور امانتِ علم کی خوف ناک خیانت ہے، والعیاذباللہ!

تیسرا نقصان مدارس اسلامیہ کی سرگرمیوں کا جو ہورہا ہے وہ ملک میں موجود بعض تعلیمی اداروں بالخصوص شاہین اکیڈمی بیدر کے ذمہ داروں کی طرف سے حفاظ وعلماء کو پُرکشش ترغیبات کے ذریعہ علومِ عصریہ اور پروفیشنل کورسس کی طرف راغب کرنے کا ہے، شاہین اکیڈمی نے تو باقاعدہ بڑے پیمانے پراور پورے ملک کا احاطہ کر کے خطیر مادی وسائل کے ذریعہ اس کا بیڑہ اُٹھایا ہوا ہے کہ حفاظ وعلماء کو کمرشیل عصری لائنوں کے لائق بنایا جائے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جوفوائد بتائے جارہے ہیں وہ فائدے ہی ہیں مگر ایک تو محض دنیا کے ہیں دوسرے فضلاءِ مدارس کے اپنے مقاصد ومیادین سے ہٹ جانے کے خطرے پر مشتمل ہیں۔جن اداروں اور شخصیتوں کواس کا خیال ہوا ہے کہ حافظوں عالموں کوڈاکٹر انجینئر بنا کر خودکفیل کردیا جائے ان کا پہلے سے بھی یہی خیال ہے کہ علماء عوام کا بوجھ بن جاتے ہیں، مدارس اپنے فضلاء کے لئے روزگار کا کوئی بندوبست نہیں کرپاتے، علماء اور خدامِ دین کوخودکفیل ہونا اور معاشی ترقیوں میں آگے بڑھتے رہنا چاہیئے، وغیرہ۔حفاظ وعلماء کے لئے کئے جارہے یہ اقدامات علماء کے تئیں اُن کے انہی احساسات کا نتیجہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کوکبھی یہ خیال نہیں آیا اور نہ اس کا کوئی منصوبہ سامنے لایا ہے کہ ڈاکٹرز انجینئرز اور دیگر پروفیشنل کورسس کئے ہوئے گریجویٹس کوحافظ وعالم بنایا جائے حالاں کہ اس صورت میں ان کا تو بہت فائدہ ہوجاتا مگر امت کا کچھ نقصان نہ ہوتا۔

ایسا نہ کر کے حفاظ وعلماء کوہدف بنانے میں ان حضرات کے کئی ایک مفادات ہیں، ایک تو خود ان کا یہ کہنا ہے کہ حافظ وعالم بچے ذہین ہوتے ہیں اور اچھے نتائج لا کر اپنی تعلیم گاہ کا نام روشن کرتے ہیں، دوسرے حفاظ وعلماء کو پروفیشن سے وابستہ کرانا بہت مال داروں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی دلی تمنا ہونے کی بنا وہ ان بچوں کی

بیش بہا امداد و کفالت کرنے کے لئے بہ خوشی تیار ہیں اور کر رہے ہیں، یہ متمول اور تعلیم یافتہ طبقے کے اس مفروضے کا نتیجہ ہے کہ علماء کو خود کفیل ہونا چاہیئے، قوم کے ٹکڑوں پر نہیں پلنا چاہیئے، نیز ان کے نزدیک مدارسِ دینیہ کی سرگرمیاں امت کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہیں، بل کہ ملت کے بچوں کا ضیاع؛ بے روزگاروں کا اضافہ؛ اور معصوم بچوں کو رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلنے سے محروم کردینے کا سبب ہیں، اگرچہ ان خیالات میں وہ کتنے ہی مخلص ہوں اور حفاظ وعلماء سے ہم دردی وخیر خواہی ہی ان کا منشاء کیوں نہ ہو پھر بھی ان خیالات کا اصل سبب ان کا مقصدِ مدارس سے بے خبر ہونا ہے، مدرسے والوں نے بھی ان کی فہم کے مطابق مدارسِ دینیہ کی ضرورت واہمیت سے اُنہیں واقف کرنے کا فریضہ ادا نہیں کیا ہے، جب سے دونوں تعلیموں کے فضلاء کے درمیان فاصلے پیدا ہوئے اجنبیت بڑھ گئی اور اجنبیت توحُّش کا سبب ہوتی ہے لامحالہ وہ اپنی جگہ ان خیالات میں حق بہ جانب اور ہم اپنی جگہ اپنی سوچ میں سچے اور مطمئن رہ گئے۔

اُنہیں نہیں معلوم کہ کتاب وسنت کا بعینہٖ محفوظ رکھنا کتنی بڑی ذمہ داری ہے، انہیں یہ نہیں معلوم کہ کتاب وسنت کی وہ زبان جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ سے اور صحابہؓ نے نبی سے خطاب کیا ہے کی حفاظت کرنا کتنی اہم ضرورت ہے، امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ عرب عالم بھی اگر حجاز مقدس کی عہد رسالت میں بولی جانے والی عربی اور ان کے مروَّج محاورات سے واقف نہیں ہوگا تو خطرہ ہے کہ وہ اپنی عربی سے کتاب وسنت کو سمجھنے کے بہ جائے اس میں تحریف کا مجرم ہوجائے۔ انہیں نہیں معلوم کہ فن حدیث اور فہم حدیث کا تحفظ ہر زمانے کی کتنی بڑی ضرورت ہے؛ انہیں نہیں معلوم کہ فقہِ اسلامی کی تکوینی تدوین کے بعد اس امانت کی حفاظت اور اس کی روشنی میں ملت اسلامیہ کی راہ نمائی ہوتے رہنا کتنا اہم مسئلہ ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ اہل السنۃ والجماعت کے اسلافِ کرام نے عقائد اسلامیہ کا تحفظ کس جان فشانی اور کیسی کیسی قربانیوں سے کیا ہے اور تواتر وتوارث کے ساتھ زمانے کے خرد و برد اور اہل ہَوا وہوس کے تصرف سے محفوظ ہم تک پہنچایا ہے اور اب ہم پر حفاظت کی کتنی بڑی ذمہ داری ہے، اُنہیں نہیں معلوم کہ اسلام کے نام سے آئے دن جونت نئے فتنے کھڑے ہو رہے ہیں، میڈیائی اسپیکرس اور دشمنانِ اسلام کے تربیت کردہ اسکالرز کی گم راہ کُن فکریں اور سطحی اشکالات جو پھیلائے جارہے ہیں ان سے ملت کو بچانے اور ان کا رد کرنے کے لئے مآخذ اسلام کے ماہرین تیار کرتے رہنا کتنا بڑا کام ہے، انہیں نہیں معلوم کہ محراب ومنبر اور مسندِ افتاء وقضاء کو منہاجِ نبوت اور صحابہؓ کی سنت پر برقرار رکھنے کے لئے دُعاۃ وقضاۃ کی تیاری کا کیا مقام ہے، انہیں نہیں معلوم کہ قوم کی بدعات وخرافات اور زمانے کے تہذیبی وثقافتی تصادمات کا مقابلہ کرسکنے والوں کی ہر علاقے اور ہر زمانے میں کتنی سخت ضرورت ہوتی ہے، اُنہیں نہیں معلوم کہ

قرآن مجید کی قراءات اوراس کے ماثور معانی کی حفاظت مسلمانوں کی کتنی بڑی ضرورت ہے۔

یہ اور اِن جیسے اہم ملی و دینی فرائض ہیں جو مدارسِ اسلامیہ کے قیام کے بنیادی مقاصد ہیں اور جن کی بہ دولت ہی اپنوں اور پرایوں کی ہزار کوششوں اور اسلام کی مصنوعی تصویروں کو پھیلانے کے باوجود اسلام اپنی اصلی شکل میں بھی دنیا میں موجود ہے، حقیقت یہ ہے کہ مدارسِ دینیہ سے فارغ ہونے والے علماء کرام ہی دین کے وہ ناصر وظاہر ہیں جن کا تذکرہ **لا تزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق** میں زبانِ رسالت سے فرمایا گیا ہے، انہیں اس کی کوئی پروانہیں ہے کہ اہلِ زمانہ کیا کہتے ہیں وہ بس اسی کو دیکھتے ہیں کہ اللہ رسول کیا فرماتے ہیں نیز اللہ رسول کی باتوں کا سلف صالحین نے کیا مطلب سمجھا ہے! وہ ہر طعن وتشنیع اور ہر تنقیص وتضحیک کو سہہ کر بھی اسی پر ڈٹے ہوتے ہیں، مگر افسوس کہ تعلیم یافتہ کہلائے جانے والے طبقے نے مدارس اوراس کے کام کو قریب سے نہیں دیکھا نہ ہی کبھی اپنے خیالات کو حقائق سے جوڑ کے دیکھنا چاہا۔

اسلام کی ان بنیادی ضرورتوں اور اساسی شعبوں کو پورا کرنے کے لئے قائم ان مدارس میں کم از کم مسلمانوں کے دس فی صد بچوں کو حصہ لینا چاہیئے تھا مگر ناقدری ولاشعوری کی بنا صرف دو سے تین فی صد بچے متوجہ ہیں، پھر ان میں غبی بھی ہیں ذہین بھی، امیر بھی ہیں غریب بھی، اس لئے آٹھ دس برس کی محنت کے بعد اُن میں سے بھی جو کریم نکل سکتا ہے وہ اس دو تین فی صد کا ایک چوتھائی یا تہائی ہے جو مذکورہ بالا انتہائی اہم ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے سرحداتِ اسلام کا مرابط بنا ہوا ہے، غور کرنا چاہیئے کہ بڑے بڑے دنیوی مفادات اور ذرائع معاش کے حوالے سے حفاظ وعلماء کو مائل کیا جائے گا توکس کے دل میں دنیا کی ہوس نہیں ہے، ذہین واہلیت رکھنے والے حفاظ اعلیٰ دینی تعلیم کے ارادے سے منحرف ہوجائیں گے مادی لائنوں میں منتقل ہوکر قوم کے دین وایمان درست کرنے کے بہ جائے ان کے دانت بنائیں گے، اور زخم سئیں گے اور آپریشن کریں گے، نقشہ نویسی اور عمارات کی تعمیر ونگرانی کریں گے حتیٰ کہ ماحول کے اثرات سے اپنی شکل وشباہت بھی بدل لیں گے، ایسے واقعات اکاّ دُکاّ اب بھی سامنے آہی رہے تھے اوراسی کا غم ختم نہ ہوا تھا کہ ان حضرات نے ہزاروں کی تعداد میں حفاظ وعلماء کو ان کے راستوں سے ہٹا کر مادی میدانوں کا مزہ دکھانے کا اعلان عام کردیا ہے۔

کاش! وہ حضرات راہِ دین کی ہر تنگی وتکلیف گوارا کر کے ملت کے دین وایمان اور عقیدہ وتہذیب کی حفاظت کرسکنے والے ان مٹھی بھر علماء کو ان کے راستوں سے ہٹانے اوران کی خدمت کے نام پر اپنا کاروبار چمکانے کے بہ جائے لاکھوں کی تعداد میں جاہل وغافل امت کے نونہالوں اور نوجوانوں کی طرف نظر عنایت فرماتے، انہیں تعلیم سے آراستہ کر کے اللہ رسول کی خوش نودی اور قوم کی دعاؤں کے مستحق بنتے، مگر زمانے کے

بگڑے ہوؤں کو سنوارنے سے مدارس کے بنے ہوؤں کو بگاڑنا آسان کام تھا اسی کو اختیار کرلیا گیا، اس کا فائدہ بہ جز اس کے کہ علماء اسلام کی ایک چھوٹی سی جماعت کو معاشی طور پر خود کفیل بنا دیا جائے اور کیا ہے؟ کیا مدارس خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے؟ کیا ان کے سامنے بار بار یہ مشورے نہیں آئے تھے؟ پھر بھی اکابرِ مدارس کی بصیرت نے مدارس سے نکلنے والی اس مٹھی بھر جماعت کو معاشی وسائل اور مادی چمک دمک سے اس لئے دور رکھا تھا کہ ملت کے دین وایمان کے تحفظ میں لگنے کے علاوہ ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے، کرنا بھی چاہیں تو دوسرا کام نہ کرسکیں، اس لئے کہ عالم اگر دنیا کے تلذذات وترقیات تک پہنچ سکتا ہے تو اس کے سینے میں بھی دل ہے وہ اسی طرف مائل ہوگا پھر اس سے راہِ خدا کے مجاہدات کی امید رکھنا کارے دارد ہے، اکابر واسلاف کی اس حکمتِ عملی کا صدقہ ہے کہ اب تک دین کو خدام مل رہے ہیں، اب اگر یہ حافظ پلس اور عالم پلس کی تحریکیں کارگر ہوگئیں اور یہ مٹھی بھر جماعتِ علماء اس کی نذر ہوگئی تو پھر مدارس اور مساجد کا اور امت کے دین کی سلامتی کا خدا ہی حافظ ہے۔

یہاں میں یہ بھی واضح کردوں کہ میں مدارسِ دینیہ میں علماء کرام کے لئے بہ قدر ضرورت سائنسی وعصری تعلیم، انگریزی وعلاقائی زبان سکھانے کا مخالف نہیں ہوں، اس کے لئے تو میں خود کوئی بیس پچیس سال سے آواز اُٹھا رہا اور ضرورت بتلا رہا ہوں، مگر یہ صرف علماء کے کام یعنی دعوت ودفاعِ اسلام میں معاونِ علم اور مددگار زبان کی حیثیت سے ہونا چاہیئے، جیسے منطق وفلسفہ کسی دور میں علماء کے لئے مفیدِ دعوت ودفاع تھے، اسی طرح اس زمانے میں ان علوم سے بہ قدر ضرورت واقفیت اور علاقائی وعالمی زبان پر قدرت تبلیغ وتعلیمِ دین میں مددگار ہے، یہ ضرورت اگر مدرسے کے ماحول میں پوری کی جائے گی تو اس کی حیثیت ضمنی ہوگی اور علومِ عالیہ کی حیثیت مقصدی ہوگی لیکن اگر علومِ عالیہ سے فراغت کے بعد فضلاء علوم عصریہ میں جائیں گے تو ان علوم کی حیثیت اب ضرورت اور ضمنیت کی نہیں رہ جائے گی بل کہ ذریعۂ معاش اور کمال کی ہوجائے گی، ان دونوں صورتوں میں نتیجے کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے جو بادی النظر میں سمجھ میں نہیں آئے گا، تدبُّر وتقابل کے ذریعے محسوس ومعلوم ہوسکتا ہے، اس لئے اِن اسکیموں اور تحریکوں کا نتیجہ ضیاعِ علماء کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

افسوس اور تعجّب تو اس پر ہے کہ ایسا کرنے والے حضرات ملک کے نام ور علماء کرام کی سرپرستی کا دعویٰ کررہے ہیں اور باقاعدہ ان کی تصاویر بھی انٹرنیٹ پر لگا رکھی ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ اس سرپرستی کی کیا حقیقت ہے، میں اپنے ان اکابر کا قدرداں اور ان کے علم وعمل کی رفعتوں کے سامنے سرنگوں ہوں، مجھے لگتا ہے کہ ان کی تائید حقائق کے ابہام واخفاء کی وجہ سے ہوگی۔ اور یہ بات کہ حافظ پلس کی یہ تحریک صرف ترکِ تعلیم کرنے والے حفاظ کے لئے ہے بہ ظاہر حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ تجربہ اس کی شہادت نہیں دیتا کہ ایک

سال میں دس ہزار ڈراپ آؤٹ حفاظ دستیاب ہوسکتے ہیں، اور اگر حفاظ کے بارے میں یہ مان بھی لیا جائے تو عالم پلس کی کیا تاویل ہوسکتی ہے؟ انہیں تو یہی کہہ کر بُلایا جارہا ہے کہ کیا عالم ڈاکٹر انجینئر نہیں بن سکتا؟ بن کیوں نہیں سکتا، بہت اچھا بن سکتا ہے مگر پھر اس کے بعد وہ دین کے کام کا رَہ نہیں سکتا، وہ بھی آپ کی طرح دینی کاموں کو کچھ چندے دے کر اپنی دنیا بناتا رہے گا، دین کو چندوں سے زیادہ رجالِ کار کی ضرورت ہے، اور رجالِ کار اپنا میدان چھوڑ چھوڑ کر جاتے رہیں گے تو انجام کار کیا ہوگا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ غبی اور پست ہمت عالم اس میں نہیں جائے گا، جو ذہین اور خود اعتماد ہے وہی جائے گا تو کیا لوگ چاہتے ہیں کہ جو عالم فقیہ بن سکتا تھا، محدث بن سکتا تھا، مفسر قرآن اور معلمِ علوم بن سکتا تھا، محقق العصر ہوسکتا تھا وہ تو دواخانہ کھول کے بیٹھ جائے اور بے چارہ کم فہم اور بطیئ الاستعداد عالم ہے وہ دینِ اسلام کا محافظ اور مسلمانوں کا راہ نما بن جائے۔

خرد کا نام جنوں رکھ لیا اور جنوں کا نام خرد
جو چاہے ترا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بہ ہر حال عرض یہ کر رہا ہوں کہ ایک عرصے سے جن لوگوں کو مدارسِ اسلامیہ اور ان کے نظامِ تعلیم و تربیت سے شکایتیں اور ذہنی تحفظات تھے انہوں نے مادی وسائل کے بل بوتے پر حفاظ اور علماء کو سبز باغ دکھا کر ان کی راہ سے ہٹا لینے کا کام شروع کر دیا ہے اور بہ قول شاہین اکیڈمی کے ڈائرکٹر محترم جناب عبدالقدیر صاحب کے اس سال پورے ملک کے طول وعرض سے وہ دس ہزار حفاظ کو عصری علوم کے ماہر بنانے اور پروفیشنل کورسس کرانے کے لئے گود لینے جارہے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ انہیں مدارس کی محنتوں کو بے اثر اور ان کے مقاصد کو سبوتاژ کرنے میں بڑی کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔

محنت کرنے والے کو محنت کا صلہ قاعدے کے مطابق ملتا ہی ہے اور جو کچھ انہوں نے بزعم خویش حفاظ و علماء کا بھلا کرنا چاہا ہے اس کے نتائج تو آنے والا وقت بتائے گا، وقت کا انتظار کرنا چاہیئے، میں نے جو کچھ لکھا ہے ان حضرات کی مخالفت میں نہیں اہلِ مدارس سے یہ جاننے کے لئے کہ آپ کے پاس آئے ہوؤں کے اندر آپ اجر وثواب ملنے اور خدا رسول کی خوش نودی حاصل ہونے کا اتنا یقین کیوں نہیں بنا پائے؟ اور امت کا غم؛ ان کی صلاح وفلاح دینی کا فکر؛ اور نبی کی کھیتی کی حفاظت کا شوق ان کے اندر کیوں پیدا نہیں کر پائے؟ کیوں وہ فراغت کے بعد دین کی خدمات میں لگنے کے بہ جائے متاع وحطامِ دنیا کی دل فریبیوں کے شکار ہو گئے؟ کیا اِن ہزارہا بچوں کا اپنی لائن بدل لینا مدارس میں ذہن سازی کرنے اور احساسِ ذمہ داری اُبھارنے کی فکروں میں کمی اور ان کے نظام میں ابتری کا اشارہ نہیں ہے؟

اگر مدارس کے فضلاء یونہی اپنا راستہ بدلتے اور قبلہ تبدیل کرتے اور مقاصد کو پامال کرتے رہیں گے تو مدارس کی محنتیں اور قوم کا سرمایہ بھی ضائع ہوگا اور دینِ خدا بھی ملحدین وزنادقہ کے ہاتھوں میں چلا جائے گا میری باتیں مبالغے پر محمول کی جاسکتی ہیں مگر میں یاددلانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگوں نے بہت سی باتوں کو قبل از وقت سمجھ کر نظرانداز کیا ہے جس کے خمیازے اب ہمیں ہی بھگتنے پڑ رہے ہیں، جب کہ ہمارے اسلاف بروقت حالات وحوادث کی نشان دہی بھی کرتے اور مقابلہ بھی شروع کردیا کرتے تھے۔

چوتھا مسئلہ داخلی بھی ہے خارجی بھی، وہ ماڈرن ٹکنالوجی بالخصوص اسمارٹ فون سے طلبہ وعلماء کا والہانہ شغف ہے، مدارس کا اندرونی نظام یہ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے کہ بعض جگہ تو اس قدر ناقص ہے کہ طلبہ واساتذہ ہر طرح کی خرافات اور اسمارٹ فون کی فحاشیات میں بہ آزادی مبتلا ہیں، بعض جگہ اساتذہ طلبہ کو لے کر فون میں مشغول دیکھے جاتے ہیں، نظماء کا بھی بہت وقت اسی بلائے بے درماں کی نذر ہورہا ہے، ایک عجیب سما اور بُرا سمے ہوتا ہے جب یہ ہاتھ میں آجاتا ہے، رات رات بھر اساتذہ کا فلموں میں مشغول رہنا بعض مدارس کے ذمہ داروں سے سنا گیا ہے، ایسے مدارس کا تو خدا ہی حافظ ہے، خدا جانے یہ مدرسہ ہے یا چندے جمع کرنے کا اڈہ اور نوٹ چھاپنے کی مشین ہے؟ ان غیرت وحمیت کے دشمنوں کو مسلمانوں کے بچے صرف اپنی جیب گرم کرنے کے لئے مل گئے ہیں، ان لوگوں کی سنگ دلی اور بے حسی پر تو خون رونے کی جی چاہتا ہے نہ قانونی پکڑ ہے نہ اخلاقی گرفت کی کوئی صورت !**اعاذنا اللہ من ھذہ الذلۃ العاجلۃ وعذاب الاٰخرۃ**

بعض مدارس میں اس کی نگرانی کا نظم ہے پھر بھی بعض طلبہ اپنی چالاکیوں سے اسمارٹ فون سے رشتہ بنائے ہوئے ہی رہتے ہیں، انجام کو نہیں سوچتے، اس سے اخلاق تو بگڑ ہی رہے ہیں صحبتیں بھی خراب ہورہی ہیں، تاہم ذمہ دار حضرات اپنے بس سے زیادہ کیا کنٹرول کرسکتے ہیں؟ اس کے لئے وہی بات ہے کہ انتظامیہ واساتذہ طلبہ کے سامنے خود مقدور بھر احتیاط کرتے ہوئے اِنہیں تنبیہ کرتے رہیں اور ممکنہ خطرات سے خبردار کرتے رہیں، بات گھوم پھر کے اسی پر آتی ہے کہ مدارس میں ماڈل رول اور آئیڈیل شخصیات کی سخت ضرورت ہے، خدا کرے کہ اس جانب توجُّہ ہوجائے کہ مدرسوں میں اہلِ تقویٰ اساتذہ کو ترجیح دی جائے اور خود مہتمم اپنے کو علم وعمل کا جامع بنائے تاکہ طلبہ اُن جیسا بننے کا شوق اپنے اندر محسوس کریں۔

مدارس سے نکلنے کے بعد فضلاء مدارس کا اسمارٹ فون میں جو ابتلائے عام نظر آرہا ہے وہ نشے کی لت کی طرح ہے، دن رات یہی مشغلہ ہے بس ناگزیر مصروفیت کے علاوہ پورا وقت اسی صنم بے رحم کی پرستش میں نکل رہا

ہے، کچھ فضلاء دینی کاموں کے نام پر دین سے زیادہ لایعنی ومعصیت کے کاموں میں مبتلا ہیں اور کچھ سراسر معصیات وبے حیائی کے مشاغل میں لگے ہوئے ہیں، افسوس کہ جولوگ امت کوخوابِ غفلت سے جگانے اور گناہوں کوچھڑا کرخدا سے ملانے کے لئے تیار کئے گئے تھےاور جن کی تیاری پر اساتذہ کی دن رات کی محنتیں اور قوم کا قیمتی کسبِ حلال صرف ہوا تھا وہ لوگ ہی جب ان خرافات وواہیات میں مبتلا رہیں گےنمازوں میں تک لاپرواہی کریں گےتوکیاوہ خفتہ راخفتہ کئے کند بیدار کےمصداق نہیں ہوجائیں گے؟

فضلاءِ مدارس علماء وصلحاء کی شکلوں میں تو ہیں مگراب ذوق بالکل اُن سے مختلف ہوتا جارہاہے،نعت سنانے کے لئے کہوتو موبائیل میں دیکھ کرسناتے ہیں،تلاوت کرنے کے لئے کہوتو موبائیل سامنے رکھ کر کرتے ہیں، تقریرکرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو موبائیل ہاتھ میں رہتاہے،جلسوں اوراسٹیجوں پر دیکھوتو موبائیل میں مشغول دکھائی دیتے ہیں،یعنی موبائیل توایک آفت ہے ہی اس کی نمائش اس سے بڑی آفت بن گئی ہے، بسا اوقات موبائل کے ساتھ اس غالیانہ تعلق کو دیکھ کرعوام مضحکہ بنارہے ہیں، میرا تجربہ یہ ہے کہ عصری علوم سے وابستہ لوگ اسمارٹ فون سے اتنے جڑے ہوئےنہیں ہیں جتنے دینی علوم سے وابستہ حضرات جڑے ہوئے ہیں، الا ماشاء اللہ! ایسے حالات میں اہل مدارس کی بڑی ذمہ داری ہے کہ تربیتِ طلبہ کےعناصر میں اس تازہ عنصر کو اہتمام سےشامل کریں،اچھانظام بنائیں اورخودبھی اچھامظاہرہ کریں، ہردورکی ترجیحات ہوتی ہیں یہ اس دورکی تربیتی ترجیح ہے۔

بہ ہرحال فضلائے مدارس کے اسمارٹ فون کے ساتھ اس شغف نے ان کوعوامی رابطہ بنانے ، مکاتب کا جال پھیلانے ،مستورات کے لئےتعلیم وتبلیغ کا انتظام کرنے ،نوجوانوں کی اخلاقی حالت سدھارنے وغیرہ جیسی اہم ذمہ داریوں سے غافل کردیاہے،اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے شکیلی، گوہری،قادیانی،عیسائی اورجانے کون کون بھولے بھالے مسلمانوں کواپنا لقمۂ تر بنانے کی کوششوں میں لگ گئے ہیں،اگرہم میدان خالی نہ چھوڑتے تودشمن کومیدان میں اُترنے کی جرأت کیسے ہوتی؟ پس یہ بھی مدارس کی پیداوار کاضیاع ہےاوراچھی تربیت کی کمی کانتیجہ ہے۔

یورپ نے کئی برس پہلے اپنے قابل لوگوں کی ٹیم کے ذریعہ پوری دنیا کےمسلمانوں کا سروے کراکے یہ معلوم کیا تھا کہ حقیقی اسلام کی جگہ ان کا پیش کردہ لبرل اسلام قبولیتِ عام کیوں حاصل نہیں کرسک رہاہے،اس کی رپورٹ میں سرویئرز نے مسلمانوں کو چارقسموں میں تقسیم کرکے دوکواپنے حق میں اوردوکومضر بتلایا تھا، ۱ دین

بے زار مسلمان: جن سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ۲۔ سیکولر اور وسیع المشرب مسلمان: یہ ان کے حق میں مددگار رہیں ۳۔ روایت پسند مسلمان: جو علماء و مشائخ کی تقلید کرتا ہے ۴۔ بنیاد پرست مسلمان: جو سلف کے راستے پر چلتے ہوئے کتاب و سنت پر مضبوطی سے جمنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں سے تیسرے کو انہوں نے ٹریڈیشنلسٹ اور چوتھے کو فنڈامنٹلسٹ کہہ کر دشمنانِ اسلام کے منصوبوں کی کامیابی اور لبرل اسلام کے فروغ میں مانع اور دافع کہا تھا، اب آپ غور کیجئے کہ چوتھے کا مصداق علماء اور تیسرے کے مصداق دین پسند عوام کے اور کون ہو سکتے ہیں؟ اور ان لوگوں کا وجود سچ پوچھئے تو مدارسِ دینیہ اور قرآن و حدیث کی حفاظت و تعلیم اور اس کی دعوت کے مراکز ہی ہیں، جب یہ تحقیق ہوئی تھی اور باقاعدہ مفصل و مکمل رپورٹ انٹرنیٹ پر آچکی تھی، کسی جاننے والے کے بتانے سے مجھے معلوم ہوئی تھی اس وقت سے میں برابر غور کر رہا ہوں کہ آخر الذکر چوتھے طبقے پر مسلسل حالات اور ناگفتہ بہ حالات پیش آرہے ہیں، جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ عیاں را چہ بیاں؟ بہ ہر حال اس وقت علماءِ حق اور مدارسِ دینیہ دشمنانِ اسلام کے دلوں کی کھٹک اور آنکھوں کا کانٹا بن گئے ہیں، اس لئے وہ اپنے عزائم کے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

مدارس دینیہ اور علماء دین کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کی مساعی عرب ملکوں میں کامیاب ہوچکی ہے، برصغیر میں تدبیریں جاری ہیں، سب جانتے ہیں کہ جب تک یہ مُلّا نے اپنی اصل پر قائم رہیں گے حقیقی اسلام کو فریبی اسلام سے بدلا نہیں جا سکے گا، برصغیر کے حکمرانوں پر عالمی قیادتوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے چوں کہ ابھی برصغیر میں کھل کر یہ اقدام نہیں کیا جا سکتا تو خاموش حربوں سے حکمراں اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش رکھنے کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور مدارس کی آزادی کا دائرہ قانونی جکڑوں سے تنگ کرنے کی پلاننگ چل رہی ہے، ادھر انگریزی نظامِ تعلیم سے متأثرہ مسلمان غلط فہمی اور حقیقت ناشناسی کی بناء مدارسِ دینیہ کو فرسودگی و قدامت کا لیبل دے کر نظرِ بد سے دیکھ رہے ہیں، زکواتیں مدارس سے روک کر کالجس میں پڑھنے والوں پر لگانے کے بڑے بڑے آپریشن کئے جا چکے ہیں، ناظموں کے کھاتوں میں اور سفیروں کے کمیشن میں چلے جانے کا بہانہ کر کے نیز غریبوں کا حق ہونے کی باتیں کر کے مال خود ہی تقسیم کرنے اور بہت سے بے ضرورت چالاک لوگوں کے گھر بھرنے کا راستہ اختیار کر لیا گیا ہے، اس کے باوجود مدارس چل رہے ہیں اور قوم کروڑوں کے مصارف دے رہی ہے تو اب نت نئے حربے اور آزما کے دیکھے جا رہے ہیں، علماء سمجھیں کہ ان حسین پردوں کے پیچھے دانستہ یا نادانستہ طور پر انہیں وسعتِ صحراء سے نکال کر شہر کا خوگر بنانے کی سازشیں تو نہیں ہو رہی ہیں۔

مدارس کے ماحولوں میں جو گرمیٔ ایمان سرد پڑتی جا رہی ہے اور عزیمت و رشد اور زہد و اتقاء کے سائے

گھٹتے جارہے ہیں، مقاصد کی راہ نمائی اور میادینِ کار کے لئے تیاری کما حقہ نہیں ہو پا رہی ہے، نفوسِ قدسیہ اور رجال ربانیہ کی جو قلت ہوتی جارہی ہے اسی سے طلبہ کے ذہن کیا کم متأثر ہو رہے تھے کہ باقاعدہ انہیں قناعت وصبر اور ایثار و مجاہدہ کے راستے سے ہٹا کر دنیا طلبی اور معاشی خوش حالی کے میدانوں میں قسمت آزمائی کے راستے دکھائے جارہے ہیں تو آپ ہی سوچئے کہ سرمایۂ ملت کو وہ نگہبان کیسے ملیں گے، جو ہر قسم کے ایثار و قربانی کے جذبات سے معمور ہو کر اور ہر ہوسِ دنیا سے دور رَہ کر صرف اور صرف ملتِ اسلامیہ کے دین اور بندگانِ خدا کے ایمان کو سلامت رکھنے؛ امانتِ کتاب وسنت کی حفاظت کرنے اور اسے چار دانگِ عالم میں پھیلانے کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیتے تھے، ان کے ہاں کام کے اعتبار سے دن رات یکساں ہو جاتے تھے، وہ اپنے نبی کی طرح ہر وقت **اللھم امتی امتی** کے گُن گاتے رہتے تھے، جن کے سینوں میں گرم دل اور جسموں میں تڑپتی روحیں ہوتی تھیں جن کی فکریں بلند؛ عزائم مضبوط؛ اور جہد وعمل لا مثال ہوتے تھے، جن کی راتیں رحمٰن کے قدموں میں سر رکھ کر بسر ہوتیں اور دن نبی کے مِشَن کو زندہ رکھنے میں گذر جاتے تھے، وہ جو اسلام کے ہر دشمن کو تہ تیغ کرنے اور ہر ملحد وزندیق کو اپنی اوقات دکھانے کا ہنر جانتے تھے، وہ جو اللہ کے دین کی خاطر جیلوں میں سڑ سکتے؛ سولیوں پر چڑھ سکتے اور دار ورسن کو شوق سے چوم سکتے تھے، جن کے لئے فقر وفاقہ گھر کی چیز اور زہد وقناعت پسند کا خاصا ہوتا تھا، جو ایک طرف شریعت وسنت کی سوغات بانٹتے رہتے تو دوسری جانب جامِ عشق ومحبت پلانے کا کام کرتے رہتے تھے، وہ جن کے بڑے بڑے کاروبار اور موروثی جائیدادیں بھی انہیں فریضۂ خدمتِ دین ومسلمین سے ایک لمحہ غفلت برتنے نہیں دیتے تھے، وہ جن کی للکاریں ایوانِ شاہی کو ہلا دیتیں، آہیں آسمانوں کو چیر ڈالتیں، اور دعائیں ارض وسما کا ماحول بدل دیتی تھیں، وہ جن کی نظر کیمیا اثر اور زبان ہدایت کی ترجمان تھی۔

آہ! کہاں تک اپنے اکابر واسلاف کی صفاتِ قیادت اور خصال رشد وہدایت اس مختصر مضمون میں بیان کروں؟ تاریخ ان کی تابناک زندگیوں اور انقلاب آفریں قربانیوں سے بھری پڑی اور اخلاف کو دعوتِ عبرت وسبق آموزی دے رہی ہیں، لیکن افسوس کہ ہم اُن کو دیکھنے کے بہ جائے غفلت میں ڈوبے اور ہوسِ دولت وشہرت ومناصب کے نشے میں چور اہلِ دنیا کی طرف دیکھ رہے ہیں، اُن کے مال ومتاع اور اندر سے بے لطف باہر سے پر شکوہ زندگیوں پر رال ٹپکا رہے ہیں، اُن جیسے بننے کے جذبات دلوں میں لئے سند فضیلت وعالمیت حاصل کر کے میدانِ عمل میں اُتر رہے ہیں، اس امت کے حالات کیا ہیں، غفلت ودین بے زاری کس سطح پر کھڑی ہے، جہالت وفلاکت کہاں تک پہنچ گئی ہے، معاشرۂ مسلمین تباہی کے کس دہانے پر پہنچ گیا ہے، بعض

نا گفتہ بہ حالات پیدا ہونے کے اسباب اور ان کا حل کیا ہے اس کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں وغیرہ کی فکریں وارثینِ انبیاء اور جانشینِ مصلحین کا اصل سرمایہ اور رأس المال ہے ، فضلاء میں اس کا پیدا کرنا مدارس کے انتظامیہ واساتذہ کی بنیادی ذمہ داری اور مقصودِ مدرسہ ہے۔

میں فطری تنزُّل اور لازمی انحطاط کی واقعیّت سے الحمد للہ بے خبر نہیں ہوں اور نہ ہی اسلاف واکابر کی ہم سری کی خوش فہمی میں مبتلا ہوں ، میرا کہنا صرف یہ ہے کہ گو ہم اکابر واسلاف کے معیار پر کھرے نہ اُتر سکیں مگر اُن کے کارناموں اور اُن کے احوال وآثار کے مسلسل تذکرے اور مطالعے کے ذریعے مدارس کے تربیتی ماحول میں جان ڈالنے کی کوششیں کریں اور خود اہل مدارس گو رسماً ہی سہی بڑوں کے اخلاق واوصاف سے متصف ہوجائیں اور طلبہ کے لئے ایک اچھا ماحول اور اللہ رسول سے جذباتی تعلق ولگاؤ کے اسباب فراہم کریں تو فضلاءِ مدارس کا معیارِ خدمت اس سے کہیں اونچا ہوسکتا ہے ، جو مدارس کے خشک ماحول اور رسمی سرگرمیوں کی وجہ سے گِر گیا ہے ، بل کہ مجھے معاف فرمائے بعض نظماء واساتذہ تو قصداً یا لہواً یا سہواً گرا بھی رہے ہیں۔ عفا اللہ عنا

مدارس کے لئے دو اہم مشوروں پر بات ختم کرتا ہوں

● چھوٹے مدارس جہاں حفظ یا ابتدائی جماعتوں کی تعلیم ہوتی ہے اُن کی ذمہ داری ہے کہ ایک طرف تعلیمی نظام کو معیاری بنانے اور طلبہ کی استعداد کو رو بہ ترقی رکھنے کی فکر کریں ، دوسری جانب اُن کی عملی زندگی کو مسنون بنائیں اور اخلاقی مہلکات کو اس طرح نکھاریں کہ حیوانیت مغلوب ہوکر ملکوتیت غالب ہوجائے ، یعنی بچوں میں صفاتِ رذیلہ سے نفرت پیدا ہوجائے اور صفاتِ حسنہ سے الفت ورغبت ، متقی وباعمل حضرات کو نگران یا مربی کی حیثیت سے باقاعدہ تقرر کیا جائے پھر ان کے اندازِ تربیت پر بھی عبوری نظر رکھی جائے تاکہ ضروری اصلاحات وتعاون کا سلسلہ جاری رہے۔

● بڑے مدارس جہاں فوقانی صفوف اور فضیلت تک کی تعلیم ہوتی ہے وہاں طلبہ کے سامنے مدارس دینیہ کے مقاصد اور فضلاء مدارس کی ذمہ داریوں پر آخری سالوں میں مسلسل روشنی ڈالی جاتی رہنی چاہیئے ، معاصر جماعتوں اور تحریکوں کی بے راہ روی اور اہل السنۃ والجماعت سے دوری سے واقف کراتے رہنا چاہیئے ، معتزلہ وخوارج کی جدید شکلوں کو دلائل کے ذریعے روشناس کرانا چاہیئے ، صرف گم راہی کے فتاویٰ سنا دینا کافی نہیں ہے ، کبھی کبھی ان اہم موضوعات پر تیار اساتذہ کے ذریعہ مہتمم کی زیر نگرانی مدرسے کے اندر ورکشاپ منعقد کرنا چاہیئے ، طلبہ کو سمجھنے پوچھنے اور مطمئن ہونے کا موقع دیا جانا چاہیئے میرے نزدیک مدارس میں طلبہ کی فکر ونظر کی

سلامتی کی فکر مقاصدِ مدرسہ میں دیگر مقاصد سے نسبتاً زیادہ ہونی چاہیئے، مدرسین کی راہنمائی وتربیت ہونی چاہیئے کہ وہ کس طرح کتاب وسنت کی تعلیم کے دوران کسی بھی مناسب وموزوں موقع کو ضائع کئے بغیر طلبہ کی فکری ذہن سازی کرتے رہا کریں، فیض الباری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں ادنیٰ مناسبت بھی ہوئی یقول ھٰذا اللعین القادیانی کہہ کراس کے خیالات کا ردضرور فرماتے تھے، مدرس کا یہی وہ مقام ہے جو تدریس کو ملازمت سے ممتاز کرتا ہے، شارحین کو کیوں کہنا پڑتا ہے کہ دراصل فلاں محدث کے دور میں فلاں فرقے کا زور تھا جس کے رد کا جذبہ ان کے کلام میں جھلکتا ہے، اور فلاں فقیہ کے دور میں فلاں بدعقیدگی پھیل رہی تھی اس لئے اس کی اصلاح کا رنگ ان کے انداز والفاظ میں غالب نظر آتا ہے، یہ امت کا غم اور اپنے فرض کے احساس ہی کا تو نتیجہ تھا، آج کل تدریس فن کا کمال دکھانے کا نام رہ گیا ہے، حالاں کہ کتاب وسنت کی فہم میں کمال اور فکر ونظر میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے فرقِ ضالہ عصریہ کے ناقص ونازل افکار ونظریات سے تقابل اپنے مسلک پر بصیرت واطمینان کا مؤثر ذریعہ ہوتا ہے جو فضلاءِ مدارس کی بنیادی ضرورت ہے۔

آخر میں ذمہ دارانِ مدارس؛ سربراہانِ تحریکات؛ اور فاضل علماء کرام ــــ جن کا مضمون میں ذکر ہے ــــ کے سامنے یہ وضاحت کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی بھی تحریک یا کام کے کسی ایک پہلو پر تنقید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناقد اس کی حسنات اور خوبیوں اور اچھے پہلوؤں کو نظر انداز یا ان کا انکار کررہا ہے، مدارس جس حال میں بھی ہیں ملت کا قیمتی سرمایہ ہیں اور بساغنیمت ہیں مگر جس پہلو کی طرف میں نے مذکورہ بالا سطروں میں توجہ دلانی چاہی ہے وہ پہلو گویا خوب صورت وطاقت ور جسم کی کم زور ہوتی اور بھڑکتی روح ہے کہ اگر وہ نکل جائے تو یہ خوب صورت جسم بے فیض وبے اثر ہوکر رہ جائے گا جو پوری امت کی خودکشی کے مترادف ہوگا، اسی طرح جن جماعتوں اور تحریکوں کا اس مضمون میں ذکر آیا ہے وہ ان پر تنقید سے کہیں زیادہ اہل مدارس کو ان کی خامی اور بے حِسی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے لایا گیا ہے، ان جماعتوں اور تحریکوں کے امت کے تئیں خلوص وخدمت کا باوجود فکری اختلاف کے میں بھی معترف ہوں اور بہ نظر تحسین دیکھتا ہوں۔

حق تعالیٰ سب ہی خدمت گذارانِ دین وملت کو سدادِ فکر وسلامتی عمل نصیب فرمائے حسنات کو قبول فرمائے زلّات کی دنیا میں اصلاح اور آخرت میں مغفرت فرمائے، بالخصوص اہلِ مدارس نظماء واساتذہ کو اپنی عظیم ذمہ داری اور بارِ امانت کے سلسلہ میں نہایت سنجیدہ جائزہ لینے اور خامیوں کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین والسلام علی النبی الکریم

گوشہ سیرت

السلام علیک یا رسول اللہ!

از: مولانا سید خواجہ نصیر الدین قاسمی*

جب حق جل مجدہٗ نے نبی رحمت ﷺ کو عزت وشرفِ نبوت سے سرفراز فرمانا چاہا تو اس کا آغاز یوں ہوا کہ آپ ﷺ کے راستے کا ہر درخت اور پتھر آپ کو سلام کرتا، اوران کی آواز آپ کی سماعت سے مس کرجاتی، آپ پیچھے، دائیں بائیں مڑ کر دیکھتے تو وہاں سوائے شجر وحجر کے کچھ نظر نہ آتا، وہ سلامِ نبوت ان الفاظ میں پیش کیا کرتے تھے''السلام علیک یا رسول اللہ!''

بعثت سے قبل آپ کا معمول یہ تھا کہ سال میں ایک مہینہ غارِ حراء میں عبادت کے لئے تشریف لے جاتے، زمانہ جاہلیت میں قریش مساکین پر خرچ کرنے اور انھیں کھانا کھلانے کو عبادت تصور کرتے تھے، آپ ﷺ کے پاس بھی کوئی حاجت مند اپنی ضرورتیں لے کر آتا آپ اس کی اعانت وامداد فرماتے اور اس کے ساتھ مشغول رہتے، جب وہ فارغ ہوکر چلا جاتا تو آپ خانہ کعبہ تشریف لے جاتے اور طواف ادا کرکے گھر واپس ہوجاتے، جس سال آپ کے سر مبارک پر تاجِ نبوت سجانا اور آپ کو منصبِ رسالت تفویض کرکے اپنے بندوں پر رحم کرنا اللہ کو منظور تھا اس سال رمضان میں آپ غارِ حرا میں تھے، باذنِ الٰہی جبرئیل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: اس وقت میں سو رہا تھا، انہوں نے کہا: پڑھو، میں نے کہا: میں پڑھ نہیں سکتا، توانہوں نے مجھے ایسے دبایا میں سمجھا کہ موت ہوجائے گی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو، (تین دفعہ ایسے ہی ہوا) پھر میں چپکے سے وہی کہنے لگا جو انہوں نے کہا تھا: اور انہوں نے سورۂ علق کی پانچ آیتیں پڑھیں۔ پھر یہ قصہ ختم ہوا، اور میں نیند سے بیدار ہوا ایسا لگا جیسے میرے قلب پر کوئی کتابی تصویر نقش کردی گئی، اور مخلوقِ خدا میں مجھے شاعر اور مجنون سے زیادہ کوئی مبغوض نہیں تھا، مجھے اُنھیں دیکھنا بھی گوارا نہ تھا، پھر میں نے دل میں کہا میں تو شاعر اور مجنون سے بہت دور رہتا ہوں، اور قریش نے کبھی مجھے شاعر اور مجنون کہہ مخاطب بھی نہیں کیا، پھر میں نے تہیہ کرلیا کہ پہاڑ کی چوٹی سے خود کو گرادوں اور اپنے آپ کو ہلاک کردوں اور راحت پا جاؤں، لیکن جیسے ہی میں نے

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ایسا کرنا چاہا، آسمانوں سے ایک آواز سنائی دی کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرئیل ہوں، میں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام صاف ستھرے آدمی کی شکل میں اُفقِ سماء میں ہیں، اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ " اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرئیل، میں اوپر دیکھتا ہی رہ گیا اور جس کام سے نکلا تھا وہ تو چھوڑ ہی دیا، میرے قدم رُک گئے، آسمان میں جہاں کہیں نظر ڈالتا یہی منظر نظر آتا اور میں کوئی اقدام نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ خدیجہؓ نے میرے تلاش میں اپنے آدمی بھیجے، وہ مکہ آئے اور چلے گئے میں اُسی حال میں رہا یہاں تک دن گذر جاتا، جبرئیل نظروں سے اوجھل ہوجاتے اور میں بھی اپنے گھر واپس آجاتا، خدیجہؓ پوچھتیں، اے ابوالقاسم! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کہاں تھے؟ میں نے آپ کی تلاش میں آدمی بھیجے وہ مکہ جاکر واپس آگئے، پھر میں نے لوگوں کی نظر میں گرا ہوا یا شاعر ہوگا یا مجنون؟ (میں یہ کیسے ہوسکتا ہوں) وہ (مجھے تسلی دیتے ہوئے) کہتیں، میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتی ہوں کہ آپ شاعر یا مجنون ہوں، اے ابوالقاسم اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ایسا نہیں کرے گا کیوں کہ میں آپ صداقت، امانت داری، حسن اخلاق اور صلہ رحمی سے خوب واقف ہوں، ابن عم وہ کیا چیز آپ نے دیکھی اور سنی ہے؟ میں نے بتایا تو خدیجہ کہنے لگی کہ مبارک ہو، آپ اس پر جمے رہیے، اللہ کی قسم! مجھے امید ہے کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔ پھر وہ اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، انہوں نے آسمانی کتب پڑھ رکھی تھیں، اور نصرانیت کو اختیار کئے ہوئے تھے، توراۃ وانجیل کا علم رکھتے تھے، حضرت خدیجہؓ نے وہ سارا قصہ کہہ سنایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا تھا، ورقہ نے سن کر کہا کہ خدیجہ اگر تو سچ کہہ رہی ہے تو وہ اس امت کے نبی ہیں اور جبرئیل یہ وہی ناموسِ اکبر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا، اُن سے کہو کہ وہ اس پر ثابت قدم رہیں۔ حضرت خدیجہؓ وہاں سے آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب بیان کیا تو آپ کا کچھ غم ہلکا ہوا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب سابق خانہ کعبہ تشریف لے گئے اور طواف فرمارہے تھے کہ ورقہ بن نوفل سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب باتیں دریافت کیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری باتیں بیان کیں تو کہا کہ تمہارے پاس وہی ناموسِ اکبر آیا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا، اور اس امت کے نبی ہو، تمہیں اذیت دی جائے گی، جھٹلایا جائے گا، قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور تمہاری مدد کی جائے گی، اگر میں وہ زمانہ پاتا تو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے ضرور تمہاری مدد کرتا، پھر اس نے آپ کے سرِ مبارک کو قریب کرکے بوسہ دیا، آپ اپنے گھر لوٹ آئے، اللہ تعالیٰ نے ورقہ کی گفتگو سے آپ کو ہمت عطا فرمائی اور آپ کے غم و بے چینی میں کمی آئی۔ (دلائل النبوۃ: ۲/ ۱۰۳، ۱۰۴)

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت اُمّ الخیر سلمیٰ بنت صخر رضی اللہ عنہا (حضرت ابوبکر صدیقؓ کی والدہ محترمہ)

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب: نام سلمیٰ، ام الخیر کنیت، قریش کے خاندان بنو تیم سے تعلق رکھتی تھیں، سلسلہ نسب کچھ اس طرح ہے۔ام الخیر سلمی بنت صخر بن عامر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ۔

شادی: آپ کی شادی اپنے چچازاد بھائی ابوقحافہ سے ہوئی، ان کی صلب سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی عظیم، اسلام کی باوقار، مایہ ناز ہستی پیدا ہوئی، جن کی شرف اور فضیلت کو بیان کرنے کے لئے یہ کیا کافی نہیں کہ جن کو دنیا ''أفضل الأمة'' سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام نامی اسم گرامی سے جانتی ہے، اسلام کے خلیفہ اول اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہیتے اور یارِ غار رہے ہیں۔

قبول اسلام: ان کے فرزند ارجمند حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبول اسلام کے بعد اپنی ساری زندگی اسلام کے فروغ ونشو ونما کے لئے صرف کردی، زندگی کا ایک ایک لمحہ دین اسلام کی آبیاری کے لئے لگایا، کفار ومشرکین کو حضرت ابوبکرؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دست وبازو بننا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سعادت مندر رفیق وہمدرد ومونس کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات سے چمٹے رہنا پسند نہ آیا، چنانچہ یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے درپے آزار ہوگئے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ خانہ کعبہ تشریف لے گئے، وہاں پر موجود مشرکین کو دعوتِ حق دی، چنانچہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو پیچھے ڈھکیل دیا، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ پر ٹوٹ پڑے، ان کو بے انتہاز دوکوب کیا، مارا پیٹا، عتبہ بن ربیعہ نے ان کو اتنا زدوکوب کیا کہ چہرہ مبارک کا حلیہ بگڑ گیا، نتیجہ میں حضرت ابوبکرؓ بے ہوش ہوگئے، اسی دوران بنی تمیم کے کچھ لوگ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کر کے حضرت ابوبکرؓ کو ان کے چنگل سے چھڑا لیا اور گھر لے گئے، گھر پہنچنے کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جب کچھ ہوش آیا تو سب سے پہلے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے''؟ (اسد الغابۃ، ام الخیر بنت صخر: ۷/ ۳۱۴، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دار العلوم دیودرگ

گھر کے لوگ ابھی حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے، وہ ملامت کرنے لگے کہ جن کی وجہ سے یہ مصیبت درپیش ہوئی، اس حالت میں بھی ان کا خیال اور اپنا کچھ خیال نہیں، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلسل یہ پوچھتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس حالت میں ہیں؟ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیریت دریافت کرکے بتاؤ؟۔

ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، انہیں اس ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آبدیدہ ہوگئے، بے ساختہ فرط محبت میں ان کی پیشانی کو چوم لیا، اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض گذار ہوئے، یارسول اللہ! یہ میری والدہ ہیں، ان کے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ عزوجل انہیں بھی نعمت اسلام سے بہرور کردے، اور عذاب جہنم سے بچالے ''وادع اللہ لها أن يستنقذها بك من النار''۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دست بدعا ہوئے، اسی وقت ام الخیر کے لئے دعا گو ہوئے، یہ دعا فوراً شرف قبولیت سے مشرف ہوئی، اسی وقت حضرت ''ام الخیر'' والدہ محترمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں۔ (معرفة الصحابة لأبي نعيم: ۶/ ۳۴۹۰، دار الوطن للنشر، الرياض)

اور بعض دیگر روایات میں ہے کہ حضرت ام جمیل بنت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا رات کے کسی پہر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عیادت اور خبر گیری کے لئے تشریف لائیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت کہاں تشریف فرما ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''دار ارقم'' میں تشریف رکھتے ہیں، والدہ محترم حضرت ابوبکر ام الخیر اور ام جمیل نے ان کو سہارا دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ''دار ارقم'' لے آئیں، چنانچہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ان کے حق میں دعائے خیر کی، اسی موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عرض گذار ہوئے، اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری والدہ کے حق میں دعائے خیر کریں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعاؤں کے نتیجے میں وہ فورا حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں۔ (الاصابة في تمييز الصحابة، أم الخير بنت صخر: ۸/ ۳۸۶، دار الکتب العلمية، بيروت)۔

یہ واقعہ بعثت کے بعد چوتھے یا پانچویں سال میں پیش آیا تھا، اس لئے اہل سیر وتاریخ کہتے ہیں، والدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ''ام الخیر'' کا قدیم الاسلام صحابیات میں شمار ہوتا ہے۔

وفات: حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا نے طویل عمر پائی، انہوں نے حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے پہلے وفات پائی، طبرانی نے روایت کیا ہے کہ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، تو اس وقت ان کے والدین کریمین حیات تھے، چنانچہ ان دونوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وراثت میں سے حصہ بھی ملا، گمان غالب یہ ہے کہ ان کی وفات عہد فاروقی میں ہوئی۔ (الاصابة في تمييز الصحابة، أم الخير بنت صخر: ۸/ ۳۸۶، دار الکتب العلمية، بيروت)۔

تذکارِ صحابہ

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ

از: مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا شماران قدیم الاسلام، جاں باز اور جاں نثار صحابہؓ میں ہوتا ہے، جنہیں کفار مکہ نے اس قدر تکلیفیں دیں کہ صحرائے عرب کی چوٹیاں حیرت کے ساتھ ان بلاکشانِ اسلام کے جذبۂ استقامت کا نظارہ کرتی رہیں۔ سنگ دل، بے رحم اور درندہ صفت کافروں نے آپ پر جبرو اکراہ اور ظلم وستم کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا؛ مگر آپ کے پائے استقامت میں ذرہ برابر تزلزل پیدا نہیں ہوا، مشرکین عرب آپ کو اس قدر اذیت دیتے اور ایسی مار دھاڑ کرتے کہ آپ گھنٹوں بے ہوش رہتے، جب ہوش میں آتے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہوجاتا۔ عمرو بن حکیم سے مروی ہے کہ مشرکین مکہ حضرت صہیب عمار، ابو فائدہ اور عامر بن فہیرہ وغیرھم کو اس قدر تکلیفیں دیتے کہ بیخود اور بیہوش ہوجاتے تھے، اور بے خودی کا یہ عالم تھا کہ یہ بھی خبر نہ رہتی تھی کہ ہماری زبانوں سے کیا نکل رہا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ (النحل) تحقیق تیرا پروردگار ان لوگوں کے لیے جنہوں نے طرح طرح کے مصائب اور فتنوں کے بعد ہجرت کی اور پھر جہاد کیا، اور صبر کیا ان باتوں کے بعد تیرا رب ان کی مغفرت کرنے والا ہے۔ یہ آیت اِنہی کے متعلق نازل ہوئی۔

مختصر سوانحی خاکہ

آپ کا نام نامی: صہیب، کنیت: ابویحییٰ، والد کا نام سنان، والدہ کا نام سلمیٰ تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: صہیب بن سنان بن مالک بن عبد عمرو بن عقیل الربعی النمیری۔

آپ کا قد میانہ، قدرے کوتاہ، چہرہ نہایت سرخ، سر کے بال گھنے، بڑھاپے میں مہندی کا خضاب لگاتے تھے، زبان میں کچھ لکنت تھی؛ جس کی بنا پر تلفظ میں دشواری ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اپنے غلام یحنس کو باغ میں یاناس یاناس کہہ کر پکار رہے تھے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے سنا اور تعجب سے فرمایا ان کو کیا ہوگیا ہے کہ لوگوں کو پکار رہے ہیں؟ (ناس عربی میں لوگوں کو کہتے ہیں) کسی نے عرض کیا کہ وہ لوگوں کو کیوں پکاریں گے؟ وہ تو اپنے

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

غلام تحنس کو بلاتے ہیں؛ لیکن لکنت کی وجہ سے اس نام کو ادا نہیں کر پاتے۔(اسد الغابۃ) آپ نہایت سخی اور نرم دل تھے، راہِ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے، جہاد کرتے، لوگوں کو بکثرت کھانا کھلاتے، نفس کی مخالفت کرتے تھے، علم وفضل والے اور اللہ پاک اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کو بجالانے میں جلدی کرنے والے تھے۔

(تاریخ ابنِ عساکر، ج24،ص215، اسد الغابہ، ج3، ص32)

حضرت صہیبؓ کے والدین کا تعلق دراصل ملکِ یمن سے تھا، اُس زمانے میں ملکِ یمن ''سلطنتِ فارس'' کے تابع تھا، حضرت صہیب رومیؓ کی پیدائش سے قبل (زمانۂ قبل از اسلام میں) ان کے والد سِنان بن مالک النُمیر ی سلطنتِ فارس کی طرف سے ملکِ یمن میں کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے، سرکاری ملازم کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً ان کا تبادلہ مختلف مقامات کی جانب ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح ایک بار سلطنتِ فارس کے بادشاہ کسریٰ نے ''الاُبلّہ'' نامی ایک مقام کے گورنر کی حیثیت سے ان کی تقرری کی، اور وہاں پہنچ کر قیام کی ہدایت کی، یہ مقام موجودہ شہر ''موصل'' (عراق کا مشہور شہر جو کہ ترکی کی سرحد سے متصل ہے، جہاں کُرد باشندوں کی اکثریت ہے) کے قرب وجوار میں کہیں واقع تھا۔

چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں سنان بن مالک النُمیر ی اپنی بیوی سلمٰی سمیت وہاں منتقل ہو گئے، اور اس علاقے کے گورنر کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا، اور یوں اس نئے مقام پر زندگی کا سفر رواں دواں ہو گیا۔

انہوں نے ابھی دنیا کی چند بہاریں دیکھیں تھیں، کہ رومی فوجیوں نے اُبلّہ پر چڑھائی کر دی، اور دیگر مال واسباب کے ساتھ رومی اس کم سن اور نونہال کو بھی پکڑ لے گئے، سنان کی باغ وبہار زندگی خزاں رسیدہ ہوگئی، صہیبؓ کی بہن امیمہ اور چچا لبید نے ان کی تلاش میں دنیا کی خاک چھان ڈالی، تمام مجمعوں، میلوں، اور موسمی بازاروں کا جائزہ لیا لیکن اس گم گشتہ کا کہیں سراغ نہیں لگا، ادھر آپ کو سلطنتِ روم میں دیگر قیدیوں کی طرح ''غلاموں کی خرید وفروخت'' کے بازار میں فروخت کر دیا گیا، جہاں مرورِ زمانہ کے ساتھ مسلسل ایک آقا سے دوسرے آقا کے ہاتھ بکتے بکاتے اور سالہا سال تک غلامی کی زنجیر میں جکڑے مختلف آقاؤں کی خدمت بجالاتے رہے؛ اس طرح صہیب رومی کے نام سے مشہور ہو گئے، بنی کلب کا ایک شخص صہیبؓ کو رومیوں سے خرید کر مکہ لے آیا اور مکہ میں عبد اللہ بن جدعان نے خرید کر آزاد کر دیا۔

دامنِ اسلام میں:

ایک مرتبہ حضرت صہیبؓ اپنے آقا کا مال لے کر تجارتی سفر پر مکہ سے باہر گئے ہوئے تھے، اور پھر چند روز بعد جب اس سفر سے واپس لوٹے تو مکہ شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے کسی آشنا سے ملاقات ہوئی، اِدھر اُدھر کی

گفتگو کے بعد اس نے یہ خبر سنائی کہ ''محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اور یہ کہ لوگوں کو وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دے رہے ہیں ......'' تب صہیب رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے دریافت کیا: ''کیا یہ وہی شخص نہیں جنہیں سب لوگ ''امین'' کے لقب سے پکارا کرتے ہیں؟'' اس نے جواب دیا: ''ہاں، یہ وہی شخص ہیں'' صہیب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ان سے ملاقات کہاں ہو سکے گی؟ اس شخص نے جواب دیا ''صفا کے قریب دارالأرقم میں''۔ چناں چہ تفتیش و تحقیق حال کے لیے آستانہ نبوت پر حاضر ہوئے، صہیب رضی اللہ عنہ جب دارالارقم کے قریب پہنچے تو وہاں اپنے ایک دوست عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) سے ملاقات ہوگئی، رسمی گفتگو کے بعد کچھ دیر دونوں خاموش رہے، پھر صہیب رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا ''عمار! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

عمار نے جواب دیا ''پہلے تم بتاؤ، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

صہیب رضی اللہ عنہ نے ہمت کر کے کہا ''میں تو اس لیے یہاں آیا ہوں کہ یہاں اس گھر میں موجود شخص (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کر سکوں اور ان کی گفتگو سن سکوں''

تب عمار کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی......اور بے ساختہ انہوں نے صہیب رضی اللہ عنہ سے کہا ''چلو آؤ، ہم ایک ساتھ ہی اندر چلتے ہیں''۔

تب یہ دونوں خوش نصیب دوست ایک ساتھ اندر داخل ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری کا اور ملاقات کا شرف نصیب ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک اور پاکیزہ گفتگو سنی، اور فوراً ہی ان دونوں کے دل ایمان کے نور سے منور ہونے لگے، دل کی دنیا میں ایمان کی بہار آنے لگی اور پھر ان دونوں نے اپنی زبان سے کلمۂ حق پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ وہ پہلے رومی شخص ہیں، جنہوں نے صدائے توحید پر لبیک کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے، کہ صہیب روم کا پہلا پھل ہے، آپ اس وقت دارارقم میں پناہ گزیں تھے، اور تیس سے زیادہ صحابہ کرام دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے، جن میں اکثر نے مشرکین کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ گو غریب الوطن تھے، اور اس سرزمین کفر میں ان کا کوئی حامی و معاون نہ تھا، تاہم غیرت ایمانی نے چُپ رہنا پسند نہ کیا تو انہوں نے ابتدا ہی میں اپنے اسلام لانے کا حال ظاہر کر دیا، اور راہ خدا میں گوناگوں مصائب و آلام اور مظالم برداشت کئے، لیکن استقامت و صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

(ملخص از اصحاب الرسول، ص:307)

ہجرت مدینہ:

جب کفاران مکہ کا ظلم وستم اپنے تمام تر حدود کو پار کر گیا، تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت عطا فرمائی، پھر گروہ در گروہ مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ منورہ کی طرف چلے گئے۔ مگر کفار مکہ نے آپ کے پیچھے بہت سارے جاسوس متعین کر دئے تھے۔ جو آپ پر ہر وقت نگاہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے آپ نکل نہیں پائے یہاں تک کہ سارے صحابہ کرام اور خود حضور علیہ الصلاۃ والسلام ہجرت کر کے مدینہ شریف چلے گئے اور مکہ میں صرف آپ اکیلے بچ گئے۔ آپ ہر وقت مدینہ شریف نکلنے کی تدبیر سوچتے رہتے تھے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ سخت ٹھنڈک کی رات تھی، اس رات آپ بار بار اس طرح باہر نکل رہے تھے جس سے کسی کو یہ پتہ چلے کہ وہ قضائے حاجت کے لئے نکل رہے ہیں، جب جاسوسوں نے دیکھا کہ آپ بار بار قضائے حاجت کے لئے نکل رہے ہیں اور پھر لوٹ کر آ جا رہے ہیں تو ان میں سے بعض نے بعض سے کہا کہ: ’’تم لوگ خوش ہو جاؤ، ہمارے معبودلات وعزیٰ نے اس کے پیٹ کو خراب کر دیا ہے۔‘‘ پھر وہ لوگ سونے کے لئے چلے گئے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے تیر وکمان لٹکایا اور ہاتھ میں تلوار لے کر نکل گئے۔ ابھی آپ کچھ ہی دور گئے تھے کہ جاسوسوں کو آپ کے نکلنے کی خبر ہوئی وہ لوگ گھبرائے ہوئے اٹھے اور جلدی جلدی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ کا پیچھا کرنے کے لئے نکل پڑے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا، جب آپ کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ اب ہم پکڑے جائیں گے تو آپ ایک اونچی جگہ پر رک کر کھڑے ہو گئے اور اپنے ترکش سے تیر نکال لیا۔ اور ان لوگوں سے کہا: ”اے قریش کے لوگو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک بڑا ہی نشانہ باز آدمی ہوں اور تیر چلانے میں میرا کوئی جواب نہیں، بخدا تم لوگ مجھ تک نہیں پہونچ پاؤ گے، یہاں تک کہ میرے پاس جتنے تیر ہیں اس سے تمہارے ایک ایک آدمی کو نہ مار ڈالوں پھر جب تک میرے ہاتھ میں تلوار رہے گی، اس سے تم کو ماروں گا۔“ ان لوگوں نے کہا: ہم ہرگز تم کو اپنی جان اور مال بچا کر کامیابی کے ساتھ جانے نہیں دیں گے، تم مکہ میں ایک غلام کی حیثیت سے مفلس ہو کر آئے تھے اور اب تم مالدار ہو گئے تو یہاں سے جانا چاہتے ہو۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنا سارا مال تم لوگوں میں چھوڑ دوں تو تم مجھے جانے دو گے، ان لوگوں نے کہا: ہاں، تب تمہیں جانے دیں گے، آپ نے اپنے خزانے کی چابی ان لوگوں کی طرف پھینک کر اپنے خزانے کا پتہ بتا دیا، پھر وہ لوگ واپس چلے گئے اور آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے شوق میں اپنی زندگی بھر کی کمائی ہوئی مال ودولت لٹا کر بے سروسامانی کے عالم میں انتہائی مشقتوں کا سامنا کرتے ہوئے آخر کار مدینہ شریف پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر جب آپ نے اپنا سارا قصہ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا تو

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابو یحییٰ تم نے نفع بخش تجارت کی۔ پھر آپ کی شان میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ (سورۂ بقرہ) کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربانی فرمانے والا ہے۔ (صور من حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۰۲ تا ۲۰۴)

غرض یہ کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اپنے مال ومتاع کے عوض متاع ایمان کا سودا خرید کر مدینہ پہنچے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ تمام واقعہ بیان کیا، یہ واقعہ سن کر آپ علیہ السلام نے بار بار یہ فرمایا: ربح صهيب ربح صهيب۔ صہیب رضی اللہ عنہ نے خوب نفع کمایا، صہیب نے خوب نفع کمایا۔ حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا میں حضرت کلثوم بن ہدم کے مہمان تھے، حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی حاضر دربار تھے، کھجوروں کا نقل ہورہا تھا، اس وقت حضرت صہیب پہنچے، بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر ان پر ٹوٹ پڑے، چونکہ سفر میں ان کی ایک آنکھ آشوب کر آئی تھی، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب سے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو ملاحظہ نہیں فرماتے کہ آشوب چشم کے باوجود کھجوریں کھا رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صہیب تمہاری آنکھ جوش کر آئی ہے، اور تم کھجوریں بھی کھاتے ہو، مزاج نہایت بذلہ سنج تھا، بولے میں صرف اپنی ایک تندرست آنکھ سے کھاتا ہوں، اس حاضر جوابی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے اختیار ہنس پڑے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ مدینہ میں حضرت سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کے یہاں مہمان ہوئے، اور حارث بن صمہ انصاری سے رشتہ اخوت قائم ہوا۔

مدنی زندگی اور غزوات میں شرکت:

مدینہ پہنچنے کے بعد ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز ہوا، جہاں مشرکینِ مکہ نہیں تھے، ان کی طرف سے وہ ایذاء رسانیوں اور بدسلوکیوں کے سلسلے نہیں تھے، اس نئی اور بدلی ہوئی زندگی میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت صحبت ومعیت اور کسبِ فیض کے لیے پیش پیش رہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے، اولین غزوہ یعنی ''بدر'' سے آخری غزوہ یعنی ''تبوک'' تک ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ شریک رہے اور دینِ برحق کی سربلندی کی خاطر بے مثال شجاعت وبہادری کا مظاہرہ کرتے رہے، اسی کیفیت میں مدینہ منورہ میں وقت گذرتا رہا، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک عہد مکمل ہوگیا۔ آپ رضی اللہ عنہ عالم پیری میں لوگوں کو جمع کر کے نہایت لطف کے ساتھ اپنے جنگی کارناموں کی دلچسپ داستان سنایا کرتے تھے۔

عہد فاروقی میں خلافت:

حضرت عمر بن خطابؓ آپ سے نہایت حسن ظن رکھتے تھے، اور خاص لطف ومحبت کے ساتھ پیش آتے تھے، انہوں نے وفات کے وقت وصیت فرمائی تھی کہ حضرت صہیب ہی ان کے جنازہ کی نماز پڑھائیں، اور اہل شوری جب خلافت کا فیصلہ نہ کریں وہ امامت کا فرض انجام دیں، چنانچہ انہوں نے تین دن تک نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا۔

وفات:

۳۸ھ میں پیمانہ حیات لبریز ہوگیا ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی، اور جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی، صاحب اکمال نے عمر ۹۰ سال اور وفات ۸۰ھ نقل کی ہے۔ (اسد الغابہ، باب الصاد والھاء، صہیب بن سنان، ج:۲/ص:۲۷)

خطاب

مکاتب قرآنیہ میں تعلیم دینا عظیم خدمت ہے

حضرت مولانا مولانا محمد یحییٰ نعمانی صاحب زید مجدہٗ کا فکر انگیز خطاب

جمع وترتیب: مفتی محمد عبدالحمید قاسمی*

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے کچھ بندوں سے ان کی حیثیت اور اہلیت سے کہیں زیادہ کام لے لیتے ہیں، خود ان کو بھی پتا نہیں چلتا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو کس عظیم کام کی توفیق عطا فرمادی ہے اور کتنے عظیم کام کے لئے اللہ نے ان کو چن لیا ہے، ان کا بھی ذہن نہیں جاتا کہ ان کی بہت سی کوششیں جو ان کو معمولی نظر آتی ہیں، حقیقت میں اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ کتنی بڑی کوششیں ہیں ان کے کتنے بڑے نتائج مستقبل میں نکلنے والے ہیں، اس کی ایک مثال ماضی قریب کی ہے" دارالعلوم دیوبند" کہ پوری دنیا میں اس کے اثرات پڑے ہیں اور پوری دنیا میں اللہ کا دین کیسے زندہ ہوا ہے، اس کی کیسے حفاظت ہوئی ہے، کیسی ترقی ہوئی ہے اس سے بہت حد تک ہر کوئی واقف ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ پوری دنیا میں کوئی شہر ایسا نہیں بچا ہے جہاں دارالعلوم دیوبند کے بانیوں، فارغین اور ان کے سلسلہ سے فائدہ اٹھانے والے، کچھ دین کی خدمت کرنے والے اور دین کو زندہ کرنے والے موجود نہ ہوں، یہ سب کچھ جو دین کی برکت نظر آرہی ہے یہ اُنہی اللہ والوں کی فکر واخلاص کا نتیجہ ہے؛ لیکن ذرا سوچیے جس وقت انار کے پیڑ کے نیچے مکتب قائم کیا گیا تھا اس وقت نہ چندہ تھا، نہ پیسے تھے، نہ طلباء تھے، نہ اساتذہ تھے، نہ لائبریری تھی، کچھ نہیں تھا، ایک مسجد میں ایک انار کے پیڑ کے سایے میں ایک طالب علم کا مکتب قائم ہوا تھا، اور آج جتنے بھی مکتب میں معلمین پڑھا رہے ہیں کسی کے ہاں ایک بچہ نہیں ہوگا، لیکن" دارالعلوم دیوبند" جب قائم ہوا تھا ایک بچہ کا مکتب تھا، اس کے پیچھے کوئی تنظیم، جماعت، جمعیت یا کوئی کمیٹی نہیں تھی، نہ اس کو کوئی جانتا تھا نہ اس کا کوئی بیانر تھا، نہ اس کا کوئی جلسہ ہوا تھا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کو دنیا میں دین زندہ کرنے والی سب سے بڑی محنت بنا دیا اس کی جڑ سے مظاہر علوم سہارنپور، شاہی مرادآباد وغیرہ پھر ساری دنیا میں مکاتب ومدارس قائم ہوئے، مساجد کو ائمہ ملے، اللہ کے دین کو زندہ کرنے والے ملے،

* معلم جامعہ صدیقیہ فیض العلم کریم نگر، تلنگانہ

نہ جانے کیا کیا ہوا، ہم جیسے کم نظر لوگوں کو بسا اوقات نظر نہیں آتا مگر اللہ تعالیٰ ہم جیسے معمولی اور بے حیثیت لوگوں سے بہت بڑا کام لے لیتے ہیں بعد کے زمانوں میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو انقلابی کام تھا اس نے ملک بدل دیا، دنیا بدل دی، اور ایک مثال قرآن اور عہد نبوی ﷺ کے زمانہ کی ہے کہ مکہ میں ہر طریقہ کے مظالم کو سہنے کے بعد بحکم الٰہی اللہ کے نبی ﷺ مہاجرین کے قافلہ کو لے کر مدینہ پہنچے، مہاجرین غریب تھے، بے وطن اور پردیسی تھے، مدینہ کے کچھ لوگ ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھے، اور ساری دنیا ان کی دشمن تھی، کوئی ان کو قبول کرنے والا نہیں تھا، حالات ایسے خوفناک اور خطرناک تھے اور کمزوری کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے پہرا دینا پڑتا تھا کہ کہیں سے کوئی آکر شب خون نہ مار دے اور معاذ اللہ نبی کریم ﷺ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے، کبھی کبھی ایسا ہوجاتا تھا کہ پورے مدینہ میں پہرا دینا پڑتا تھا، بعض مرتبہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام گھوڑوں پر جا کر دیکھ کر آتے تھے کہ مدینہ محفوظ ہے یا نہیں ہے؟ قرآن حکیم نے اس خوف کا نقشہ کھینچا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، تمہیں لوگوں نے (تمہاری) سرزمین میں دبا کر رکھا ہوا تھا، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک کر لے جائیں گے۔ پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا، اور اپنی مدد سے تمہیں مضبوط بنا دیا، اور تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا، تاکہ تم شکر کرو۔ (سورۃ الانفال) اور جس وقت یہ خبر ملی کہ تمام عرب کے قبیلے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں، (جسے ہم غزوہ خندق کے نام سے جانتے ہیں) بڑے بڑے صحابہ بھی خوف میں تھے قرآن تو کہتا ہے کہ ان کے کلیجے منہ کو آ گئے وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ (سورۃ الاحزاب) ترجمہ: ''اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں، اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے، اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے لگے تھے'' صحابہؓ کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسے اور بدگمانیاں آنے لگیں، پھر آپ ﷺ نے حملہ کرنے کا ارادہ فرمایا مدینہ کے لوگوں کی مردم شماری کرائی تو کل تعداد بالغ مردوں کی پندرہ سو تھی۔ اس صورت حال کو ذکر کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم بھی سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی بڑا کام لے گا ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ نے پندرہ سو کی معمولی تعداد سے فرمایا: اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کے والی وارث ہیں، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ (سورۃ الانفال) مطلب یہ ہے کہ تم جو دین کا کام کررہے ہو اگر تم یہ کام چھوڑ دو گے تو پوری دنیا میں فساد ہوگا، اللہ کی نگاہ میں یہ کام اتنا بڑا تھا کہ صرف

پندرہ سو ایمان والوں کی تعداد ہے جس سے پوری دنیا میں فساد نہیں ہوگا، ایسے ہی جو اللہ کے بندوں کو مکتب پڑھا رہے ہیں توحید اور ایمان سکھا رہے ہیں یہ بہت بڑا کام ہے ذرا بتایئے کہ اگر مکتب پڑھانے والے نہ ہوں تو کیا بچے حقیقی ایمان کو جان پائیں گے اس خدمت کی وجہ سے ہمارے اندر کبر بھی نہ آئے، اس لئے کہ جب ہم اپنے آپ کو اچھا سمجھنے لگیں تو ہم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے گر جائیں گے اس لئے اس بیماری میں مبتلاء نہ ہوں، اگر ہم میں سے ہر کوئی اپنی زندگی میں دو چار ہزار بچوں کو دین سکھا دیں تو دنیا میں اصلاح کا کام ہوتا رہے گا، صرف پندرہ سو ایمان والوں کی تعداد جس سے پوری دنیا کی اصلاح ہوجائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نگاہ جس طرف دیکھ رہی تھیں اس طرف دنیا والوں کی نگاہیں بھی نہیں جارہی تھیں، دیہات میں پڑھانے والے معلمین غریب بھی ہیں، معمولی قسم کے سمجھے بھی جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے کاموں میں ایسی برکت دینے والا ہے کہ پوری دنیا میں ان شاء اللہ بہت سوں کو اسلام کی توفیق ہوگی اور اصلاح ہوگی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم لوگ محسوس نہیں کرتے لیکن اللہ تعالیٰ ہم سے بہت بڑا کام لے رہا ہوتا ہے، بغیر کسی مبالغہ کے یہ بات عرض ہے کہ جو مکتب پڑھارہے ہیں درحقیقت اللہ کے بندوں کو شرک سے روک کر توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا سکھارہے ہیں اور ان کو یہ بتارہیں کہ اس دنیا میں مالک ومختار طاقت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، باقی دنیا میں جن چیزوں کی عبادت اور پوجا ہورہی ہے کچھ نہیں ہے یہ انسانوں کے گھڑے ہوئے خدا ہیں یہ جھوٹے خدا ہیں اصل عبادت اللہ کی ہے اس نے اپنی عبادت اور بندگی کے لئے ہمیں پیدا کیا ہے، خود سوچیں اگر آپ نہ ہوں تو یہ بچے کیا حقیقی ایمان کو جان پائیں گے، اگر اپنی زندگی میں دو چار ہزار بچوں کو ایمان سکھا کر جائیں، ــــ احکام تو دور کی بات ہے ــــ پچھلے زمانہ کے لوگ ایسی محنت نہ کرتے تو اس وقت کے مسلمانوں کی بڑی تعداد عقائد کے اعتبار سے غیر مومن ہوچکی ہوتی، مکتب میں پڑھانے والے اپنی عظیم خدمت کی وجہ سے قابل قدر ہیں، جب معلم ایک بچے کو پڑھاتا ہے تو اس نے اس کو مومن بنادیا بچے کو دین پڑھانے اور دین سکھانے کی وجہ سے چاہے وہ نماز نہ پڑھے لیکن اس کے دل میں ایمان کی عزت پیدا ہوجاتی ہے، وہ ارتداد کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ کبھی اس کے سامنے کفر کی دعوت آئے گی تو ایک منٹ سوچے بغیر وہ اس کو رد کردے گا، مکتب میں پڑھانا ایک متعدی فائدہ ہے جو بچے مکتب میں پڑھتے ہیں واقعتاً مومن بن جاتے ہیں، اور ایمان پر ان کے پاؤں جم جاتے ہیں، وہ اپنے گھر میں ایمان جمانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، خاندان اور دوست واحباب اور جو مکتب آنے والے نہیں ہیں سب کا فائدہ ہوگا، ہم دو ہزار بچوں کو پڑھارہے ہیں تو وہ ہزاروں بچوں کو پھر وہ اپنی نسلوں کو پڑھائیں گے ان شاء اللہ، یہ نفع بہت متعدی ہے پھر ہمارے مکاتب میں جو

بچے آتے ہیں وہ نماز بھی پڑھتے ہیں، ان شاء اللہ ان میں سے بہت سے صالحین بھی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو دنیا میں زندہ رکھنے کا ذریعہ بنیں گے۔

ہم لوگوں پر اللہ کا احسان ہے ہم لوگوں کو ہماری تمام ناپاکیوں اور گنہگاریوں کے باوجود اللہ کے دین کے زندہ کرنے کے کام میں لگایا ہوا ہے، اور جو بھی اخلاص سے کام کرے گا اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی نعمتیں اس کو آخرت کی زندگی میں ملیں گی ان شاء اللہ اور لوگوں کو ایمان سکھانے کے برابر کوئی عمل خیر نہیں، اگر کوئی ساری زندگی تہجد پڑھے رات بھر عبادت کرے تو ہم کہیں گے مکتب میں پڑھانے سے جو تمہیں ثواب ملے گا وہ رات بھر عبارت کرنے سے بھی نہیں ملے گا۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خیبر کی طرف بھیجا بھیجتے وقت فرمایا اے علی رضی اللہ عنہ اگر اللہ تمہارے ذریعہ سے کسی ایک آدمی کو ھدایت دیدے تو تمہارے لیے بہت سے لال رنگ کے اونٹوں سے قیمتی ہے، الحمد للہ آپ مکتب میں تعلیم دیتے ہیں اگر اخلاص ہوگا تو ان شاء اللہ ہزاروں لوگوں کی ہدایت ہمارے نامۂ اعمال میں ہوگی، دنیا کی دولت اور دنیا کی ترقیاں اس نعمت کے مقابلہ میں گرد پا کے برابر بھی نہیں ہے، کاش ہمیں یقین ہوتا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کے کام کے لئے چن لیتا ہے ان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کے دین کا کام ہوتا ہے، اگر ہمارے اندر عجب، کبر اور غفلت پیدا ہو جائے تو ہم لوگ بڑے نقصان والے ہو جائیں گے اور ہماری نیکیاں ضائع ہو جائیں گی بالکل خالی ہاتھ قبر میں جائیں گے۔

اللہ کی جو دینی نعمت ہو اس کا احساس بھی ہونا چاہئے اس پر شکر بھی ہونا چاہئے اور دل سے اس پر خوش بھی ہونا چاہئے دنیا کی سب عزتیں اور راحتیں اللہ کے دین کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے یہ سب کچھ بے حیثیت ہے، اللہ نے ہم میں سے اکثر کو طلب اور خواہش کے بغیر دین کے راستہ پر ڈال دیا ہے ہمارے اندر تو اتنی دین کی طلب نہ تھی اور نہ ہوتی کہ بڑے ہو کر یہ راستہ خود چن لیتے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ بھی اسی طرح ہے کہ وہ کسی طریقہ سے صحابہ کے ہاتھ آئے صحابہ کرام نے ان کو پکڑ کر مدینہ لے آئے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیکھا کہ ایک دشمن ایک علاقہ کا بادشاہ قید کر کر لایا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا مسجد کے فلاں ستون سے باندھو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز کے لئے تشریف لاتے تو پوچھتے ثمامہ کیا حال ہے؟ ثمامہ کہتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اگر تم قتل کروگے تو تم ایسے کو قتل کروگے جس کو قتل کرنا جائز ہے تو تم مجھے قتل کردو کوئی غلط بات نہیں ہے، اگر تم احسان کر کے چھوڑ دوگے تو شکر کروں گا اور تم مجھے شکر گزار پاؤ گے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چلے جاتے تھے تین دن ایسے ہی قید میں رہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چھوڑ دیا، ان تین دنوں میں اسلام

کے بارے میں پوچھ لیا تھا اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ مسجد کے باہر گئے کسی سے کچھ نہ کہا دوبارہ مسجد میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر کہا: اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی خوشی کے عالم میں ایک بات بیان فرمائی کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جنت میں جانا نہیں چاہتے لیکن زنجیروں میں باندھ کر اللہ جنت میں پہنچا دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کام بہت عظیم ہے آزمائشیں بھی ہوں گی اور مسائل بھی ہوں گے، تنظیموں اور اداروں کے ذمہ داروں سے کہتا ہوں کہ جو علماء کرام امت سے روابط رکھتے ہیں، دین کی خدمت کرنے والے جو صرف اللہ کے دین اور اس کی اطاعت کی وجہ سے نہ مزدوری کر سکتے ہیں نہ تجارت کر سکتے ہیں انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے وقف کیا ہوا ہے، ایسے معلمین اور اساتذہ کی معاشی خدمت کرنے کا ارادہ کریں۔

میں اساتذہ سے کہتا ہوں کہ دین کی خدمت تو فاقہ رکھ کر بھی کی جائے تو سعادت کی بات ہے دعا تو خوش حالی کی کرنا ہے لیکن کچھ پریشانی ہو تو بہادری اور ہمت کے ساتھ اس کو برداشت کرنا ہے اس لئے کہ اس کا جو اجر ہے دنیا میں کسی اور چیز کا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کے لئے آپ کو اور ہمیں چنا ہے اور اس راستہ کا کچھ حق بھی ہے، سب سے پہلی بات ہمارے اندر اخلاص ہونا چاہئے، مولانا علی میاں ندویؒ ایک بات کہا کرتے تھے ''بہت سے لوگوں میں بد نیتی نہیں ہوتی لیکن بے نیتی ہوتی ہے'' جو کام بھی ہم کر رہے ہیں اللہ کو راضی کرنے اور اور آخرت کے اجر و ثواب کے لئے کریں۔ یہ نیت زندہ اور طاقتور ہونا چاہئے حضرت فرمایا کرتے تھے بد نیتی بھی غلط ہے بے نیتی بھی غلط ہے تو ہم لوگوں میں غفلت کی وجہ سے بے نیتی ہوتی ہے خیال تازہ نہیں ہوتا ہے۔ ہر لمحہ اللہ کے راستے میں نیت کیسے پیدا کرنا؟ حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں پہنچے، حضرت رائے پوریؒ نے ان سے کہا: میں ہر ایک کو ایک عمل بتلاتا ہوں آپ دین کا کوئی بھی کام کریں مثلاً بیان کریں یا مضمون لکھنے یا پڑھانے کے لئے بیٹھیں پہلے دل میں اچھی طرح سوچ لیں کہ میں یہ کام اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کر رہا ہوں، ہر وقت تازہ نیت کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش کریں، ہم نے مولانا منظور نعمانیؒ کو ان کی آخری عمر میں دیکھا جب بیان کرتے تھے چند لمحوں کے لئے آنکھ بند کر کے خاموش رہا کرتے تھے، اسی طرح عمل کریں گے تو اخلاص پیدا ہوگا، قرآن پڑھانے والے اور دین پر چلنے والے اور عوام کے عمل کے درمیان فرق ہونا چاہئے، حضرت مسیح الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ عوام اور علماء کی نماز میں فرق ہونا چاہئے یعنی اچھی ہونی چاہئے ایسا نہ ہو کہ عوام کی نماز پانچ منٹ ہو تو امام کی چار منٹ میں ہو رہی ہو اور معلم سب سے آخر میں آتا ہو اور پہلے چلے جاتا ہو بتایئے اس کا اثر عوام پر کیا پڑے گا؟ عوام ہر چیز کو دیکھتی

ہے تجربہ کی بات یہ ہے کہ اگر عوام کو حسن ظن ہوگا یہ نیک آدمی ہے یہ اللہ والے آدمی ہیں تو بڑا نفع پہنچے گا حسن ظن شرط ہے ہم لوگ کوشش کریں ہمارے اعمال عوام سے اچھے ہوں، اخلاق کی اصلاح ہو۔ مثلاً ہم میں برداشت ہو، تکبر، حسد اور لالچ نہ ہو، زبان اچھی ہو، یہ پڑھانا؛ دعوت وتبلیغ کا کام کرنا اسی وقت قبول ہوگا جب یہ سب عمل ہم میں بھی ہوں، یعنی وہ بات کو صحیح سمجھتا ہوتو اس پر دل سے ایمان ہوتا کہ جو کچھ پڑھا رہا وہ خود بھی عمل کرے، حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ علم سارا کا سارا دنیا کا کام ہے آخرت کا کام نہیں ہے جب تک کہ اس پر عمل نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ ساری زندگی تو دنیا ہمیں ملی نہیں اور دین سے بھی خالی ہاتھ جانا پڑے، دنیا تو ہمیں ملی نہیں بظاہر ہمیں ملے گی بھی نہیں، البتہ تجربہ ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اور دین کی خدمت کے راستہ میں لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرورت نہیں روکتا۔ حضرت شیخ زکریاؒ بڑی اثر انگیز بات بیان کرتے تھے اگر کسی مالدار آدمی کی کوٹھری پر کوئی کتا روز آنہ رات کو پہرا دینے لگے اس کوٹھری کے قریب سے کسی کو گزرنے نہ دے، کیسا کمینہ مالدار ہو اس کتے کو روٹی نہ ڈالے گا؟ پھر فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کو اتنا بے غیرت سمجھتے ہو کہ تم دن بھر اللہ کے دین کی حفاظت کرواور وہ تمہاری ضرورت پوری نہیں کرے گا اور حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ اکابر کا فقر وفاقہ اور پریشانی سے دھوکے میں مت پڑنا وہ بڑے لوگ تھے وہ پریشانی والے راستے مانگ لیا کرتے تھے ان کا فقر اختیاری ہوتا تھا وہ اس کو پسند کرتے تھے ہم کمزور لوگ ہیں اس کو پسند نہیں کرتے۔

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا کہ احد کا پہاڑ سونے کا بنادوں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو پسند نہیں فرمایا، فرمایا: اے اللہ میں تو چاہتا ہوں کہ میں ایک وقت کھاؤں شکر ادا کروں اور ایک وقت بھوکا رہوں اور صبر کروں۔ ہم کمزور ہیں دعا کا اہتمام کریں ضرورت نہیں رُکے گی ان شاء اللہ، اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کریں، خوب اللہ کی رضا کی نیت کو تازہ کرکے کام کریں، اپنے اعمال کی حفاظت ہونا چاہئے، عوام سے اچھا تعلق ہونا چاہئے، غصہ سے پرہیز کرنا چاہیئے، اخلاق کی اصلاح کے لئے کوئی ہمارا بڑا ہونا چاہئے اللہ کے نیک بندہ سے اصلاحی تعلق قائم کریں، دعا کا اہتمام کریں، دل کی ہدایت (شرح صدر) ذکر ودعا سے ہے، دعا دیر تک مانگنا چاہئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خدام دین کی مدد فرمائیں اور ان کی خدمات کو قبول فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

اصلاحی مضامین

رمضان گزر گیا۔۔۔۔۔

از: مولانا عبدالعلی فاروقی*

کبھی دنیا اور اس کے جھمیلے فرصت دیں تو ایک مسلمان کی حیثیت سے اس پر ضرور غور کیجئے گا کہ ’’رمضان میں کیا کمایا؟ اور کیا گنوایا؟‘‘۔

نفع اور نقصان کا حساب کتاب کرتے ہوئے اس پر نگاہ رکھنا، عقل مندی کی علامت بھی ہے اور مستقل خسارے سے بچانے کا مجرب و کامیاب نسخہ بھی۔ پھر رمضان کا مہینہ تو رحمتوں، برکتوں اور رزق کی بارش کا پورے سال میں سب سے ممتاز مہینہ بھی ہوتا ہے اور آخرت کے لئے ’’کام آنے والے سامان‘‘ کا ذخیرہ کرنے، یا خالی ہاتھ رہ جانے کا بے مثال موقع بھی ہوتا ہے۔

اس لئے اب جب کہ یہ مبارک مہینہ گزر چکا اور خوش نصیب و بدنصیب لوگ اپنے اپنے حصہ کی کمائی کر چکے۔ تو ایک مرتبہ نفع ونقصان کا جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے کہ نفع حاصل کرنے والے، کچھ اور بڑھ چڑھ کر کوشش کر کے اپنے نفع کی مقدار بڑھا سکیں اور نقصان اٹھانے والے اپنی اس ڈگر کو بدلنے کا فیصلہ لے سکیں، جو نقصان رساں ہے اور نفع بخش ڈگر پر چل کر آئندہ وہ نفع حاصل کرنے والوں میں شامل ہو سکیں؟۔

تو آیئے ہم اپنا اور اپنے گھروں کا جائزہ لے کر خود اپنے ضمیروں سے فیصلہ کرائیں کہ ہم نے رمضان میں ’’رمضان والے اعمال‘‘ اور ’’رمضان کی مطلوبہ زندگی‘‘ میں اپنی کتنی حصہ داری رکھی؟ کم از کم ستر گنا نفع حاصل ہونے کے ’’آفر‘‘ کی طرف ہم نے توجہ کی یا اس ’’خدائی پیکیج‘‘ کو نکار دیا؟ چھوٹی اور تھوڑی مشقت (نفل عبادات) کے ذریعہ بڑے اور کثیر نفع حاصل کرنے (فرائض کے برابر ثواب حاصل ہونے) کے ’’خصوصی سیزن‘‘ (رمضان) میں ہم نے ایک عقل مند و بامراد تاجر ہونے کا ثبوت دیا، یا سست و کاہل اور کام چور غافل ہونے کا؟۔

یہ ٹھیک ہے کہ رمضان کا مہینہ تو آ کر گزر بھی گیا مگر یہ یاد رکھئے کہ وہ پھر آنے کے لئے گیا ہے۔ خدائی نظام کے مطابق ہر گیارہ مہینوں کے بعد رمضان آتا رہے گا قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہمیں اب کوئی رمضان کا مہینہ ملے

* ناظم دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ

گا، یا ہماری زندگی کا آخری رمضان آکر گزر گیا؟ اگر اس سوال پر ہم غور کریں گے تو ہمیں اس کا کوئی حتمی و قطعی جواب نہیں مل سکے گا۔ کیوں کہ اس کا صحیح و قطعی جواب اسی وقت مل سکے گا جب ہمیں اپنی موت کا بالکل صحیح وقت معلوم ہو سکے؟ موت کا صحیح وقت معلوم ہونے ہی پر ہم اس کا فیصلہ کر سکیں گے کہ اگر ہماری موت، اگلا رمضان آنے سے پہلے ہی ہونا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری زندگی کا آخری رمضان گزر گیا اور اگر ہم کو صحیح طور پر اس کا علم ہو جائے کہ ہماری موت اگلے رمضان کے بعد ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی ہمیں اپنی زندگی میں رمضان کا مبارک مہینہ اور اس مہینے میں آخرت کی کمائی کرنے کا موقع ملے گا؟ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں اپنی موت کے صحیح وقت کا کسی بھی ذریعہ سے علم ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں صاف صاف اور واضح انداز میں اعلان فرما دیا ہے کہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کا علم ہم نے کسی کو نہیں دیا ہے اور ان پانچ چیزوں میں ایک موت کا صحیح وقت اور اس کا صحیح مقام بھی ہے۔

یوں تو اللہ کی طاقت و قدرت کے آگے بڑے سے بڑے شہ زور کو بھی جھکنا ہی پڑتا ہے اور ہر عقل مند آدمی کو یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اس کے کہے کو ٹالنے اور اس کی طاقت و قدرت کو نظر انداز کر کے اپنی منوا لینے کی کسی کی اوقات نہیں ہوتی اور ہوتا وہی ہے جو وہ کہہ دیتا ہے مگر ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہم تو اپنی زبانوں سے بھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ جو چاہے وہی ہوتا ہے یعنی (جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہے نہیں ہوتا)

ایسی بے بسی اور موت کے وقت کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ اندیشہ تو موجود ہی رہے گا کہ ہو سکتا ہے کہ جو رمضان گزر گیا وہی میری زندگی کا آخری رمضان ہو اور اب ہمیں رمضان کے ''موسم بہار'' سے کمائی کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور جب یہ خیال آئے گا تو لامحالہ یہ سوچنے کی بھی توفیق ملے گی کہ ہم نے اپنی زندگی کے گزرے ہوئے آخری رمضان میں کیا پایا اور کیا کھویا؟ دنیا کی عارضی زندگی کے موت کے ذریعہ اختتام ہو جانے کے بعد آخرت کی دائمی زندگی کی راحت و عافیت کے لئے کچھ ذخیرہ کیا ہے کہ نہیں؟ اور جب کوئی بھی مسلمان اپنے رحیم و کریم پروردگار کی لاتعداد نعمتوں کے مقابلہ میں اپنی نیکیوں اور نیک اعمال کا جائزہ لے گا تو اسے خود ہی اس فیصلہ پر مجبور ہونا پڑے گا کہ ہماری تھوڑی سی نیکیاں اور کچھ اچھے اعمال، اللہ تعالیٰ کی بخشش و عطا کے سامنے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور بس ''یہی مبارک احساس'' تلافی مافات پر مجبور کر کے ایک ایک لمحہ کی قدر کرنے پر مجبور کر دے گا۔

ہم نے، آپ نے بہت سے اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں سیکڑوں گنا زیادہ نیکیاں کرنے اور اپنے شب و روز اپنے خالق کی رضا کو حاصل کرنے میں صرف کرنے کے

باوجود ہم سے کہیں زیادہ بے چین و بے قرار رہتے ہیں۔ان کی آنکھیں ندامت کے آنسوؤں سے ہمہ وقت بھیگی نظر آتی ہیں اور وہ اپنے پاس کچھ لینے اور دعا کرانے کے لئے آنے والوں سے الٹے خود ہی عاجزی ومسکنت کے ساتھ اپنے ''حسن خاتمہ'' کے لئے دعا کی درخواست کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے دو بزرگوں کا حال بیان کر دینا مناسب ہوگا ان میں کی پہلی شخصیت حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلیفۂ اجل، اپنے وقت کے ولی کامل اور حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ جیسے بے نفس ومحبوب خلائق بزرگ کے استاذ اور مرشد حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ سابق ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی ہے۔جن کی دنیا ومتاع دنیا سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ صرف دو جوڑے کپڑے استعمال میں رہتے اور ان میں بھی کلف واستری کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔جو جوڑا اتارتے وہ دھونے اور تہ کرنے کے بعد ان کے گاؤ تکیے کے نیچے دبا دیا جاتا اور اس پر اس طرح پریس ہو جاتا اور اگلے موقع پر اسے پہن لیتے۔عبادت وتقویٰ کا یہ حال تھا کہ باوجود مدرسہ اور مدرسہ کے طلبہ واساتذہ کی ضرورت کی وجہ سے مدرسہ میں قیام کرنے کے،صرف اس لحاظ میں کہ میں اپنی نجی ضروریات کے لئے بھی استعمال کر رہا ہوں، مدرسہ کی بجلی نہیں استعمال کرتے تھے اور اپنے کمرہ میں سب میٹر لگوا رکھا تھا،جس کے ذریعہ ہر ماہ میں ہونے والے خرچ کی اپنی قلیل تنخواہ سے مدرسہ کو ادائیگی کرتے تھے۔دیگر عبادات کے ساتھ ساتھ نماز باجماعت کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ انتہائی معذوری کے عالم میں جب کہ دو طالب علم ان کی چارپائی کمرہ سے اٹھا کر مسجد میں لے جا کر رکھ دیتے اور وہ صف اول میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے،ان کے منھ سے بے ساختہ نکل گیا تھا کہ بفضلہٖ تعالیٰ ۷۲ / برس سے تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی ہے (جماعت یا کسی رکعت کے ترک ہونے کا تو ذکر ہی کیا) عبادت وتقویٰ کے اس اہتمام کے باوجود راقم الحروف نے متعدد مرتبہ یہ دیکھا کہ کوئی عقیدت مند دور دراز سے ان کی زیارت وملاقات کر کے ان سے دعائیں لینے کے لئے حاضر ہوا،اس کی طلب کو پورا کیا اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس سے اپنے گناہوں کا حوالہ دیتے ہوئے ''حسن خاتمہ'' کی درخواست کرتے نظر آئے۔یعنی اپنی نیکیوں اور نیک اعمال کی طرف کوئی نگاہ ہی نہیں،بس ایک بے چینی و بے قراری ہے کہ انجام بخیر ہو، جسے صرف اور صرف خدا کی رحمت کر سکتی ہے۔

دوسری شخصیت اسی ادارہ سے وابستہ مرشد کامل شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ مہاجر مدنی کی ہے،جنہوں نے اپنی '' آپ بیتی'' میں ایک مقام پر بہت ہی حسرت وافسوس کے ساتھ اپنے ضعف و بڑھاپے کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ '' اب میرے رمضان بھی کیا رمضان، ہاں جوانی اور قوت جسمانی کا ایک وقت

ضرور تھا کہ میں رمضان کے ہر دن میں دیگر معمولات کے ساتھ ساتھ ایک قرآن مکمل کرلیا کرتا تھا اور پھر آگے وہ ترتیب بھی بیان فرمائی ہے کہ کس کس طرح اور کس کس نماز کے وقت کتنے پاروں کی تلاوت کرتے تھے؟ ان دو ''مثالی بزرگوں'' کا ذکر اس مقام پر اپنے جیسے ناکارہ لوگوں کی عبرت کے لئے کیا کہ اگر کسی طرح خالق سے زیادہ مخلوق کی ملامت کے ڈر سے پانچ وقت کی آدھی ادھوری نماز پڑھ لی تو یہ احساس کرنے لگے کہ ہم کم سے کم خدا کے فریضہ کی طرف سے تو غافل نہیں ہیں اور اگر کہیں رمضان کے روزوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار دو چار رکعت نفل کی ادائیگی اور تلاوت قرآن بھی ہوگئی تو پھر کہنا ہی کیا، دماغوں میں شیطان اپنا مضبوط گھونسلہ بنا کر اس احساس کو مضبوط کرنے لگتا ہے کہ ''ہم بھی کچھ ہیں؟'' اور اگر اپنی ولایت و بزرگی، یا کم از کم خدا کا اطاعت گزار بندہ ہونے کا ''مرض'' جڑ پکڑ لے تو آگے کے لئے خیر کی طلب کے دروازے خود بہ خود بند ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ نیکیوں کے موسم بہار اور عطائے خداوندی کا بے مثل مہینہ رمضان تو ضرور گزر گیا۔مگر خدا کی رحمت وعنایات کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں اور وہ ہماری اس دنیاوی زندگی کی آخری سانس تک کھلے رہیں گے رمضان جیسے بابرکت مہینے کو پاکر اپنی بخشش کا سامان نہ کر لینا، یقینا بڑی محرومی اور بڑا خسارہ ہے، لیکن ہماری خوش بختی یہ ہے کہ اس خسارہ کی تلافی کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور خدا کی رحمت ہماری طلب سے بھی زیادہ ہمیں دینے کے لئے آمادہ و تیار ہے۔بس ضرورت ان اشک ہائے ندامت کی ہے جو اپنی محرومی کے احساس پر بے ساختہ بہ پڑیں، ان سرد آہوں کی ہے جو عرش الٰہی سے جاٹکرائیں اور ان سجدہ ہائے بےقرار کی ہے جن پر ہمارے قادر ومقتدر مالک کو ترس آجائے۔

اللہ ہمیں توفیق دے کہ کھونے کے بعد بھی پانے کا سامان کرسکیں۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

دولہے کو سہرا باندھنا

سوال: کیا نکاح کے موقعہ پر دولہے کے سر پر "سہرا" باندھنا جائز ہے؟

جواب: شادی میں دولہے کو سہرا باندھنا ایک ہندوانہ بے اصل رسم ہے، اس کا ترک کرنا لازم ہے؛ البتہ نکاح کے وقت باوقار انداز میں عمامہ باندھنا بہتر ہے۔ (کتاب المسائل، ۴/ ۳۱۲)

شادی میں کار سجانا

سوال: شادی کے موقعہ ہر نوشہ کی کار کو پھولوں وغیرہ سے سجانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: نوشہ کی کار کا سجانا کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے، اس لئے کہ اس سجاوٹ سے کوئی دینی ودنیوی فائدہ وابستہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ صرف وقتی زینت اور مال کا بے جا استعمال ہے، اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

(کتاب المسائل، ۴/ ۳۱۳)

نکاح میں شرکت کے لئے غیر مسلم کا مسجد میں داخل ہونا

سوال: کیا کوئی غیر مسلم اپنے مسلم دوست کے نکاح میں مسجد میں داخل ہوسکتا ہے؟

جواب: اگر وہ غیر مسلم، ظاہری نجاست وغیرہ سے پاک ہو، اور کسی فتنہ کا خوف نہ ہو تو اس کا مسجد میں داخل ہونا شرعاً منع نہیں ہے۔ (مستفاد از: کتاب المسائل، ۴/ ۳۲۲)

ہبہ کرنے کے بعد واپسی کا مطالبہ کرنا

سوال: ہبہ کرنے کے بعد واپسی مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اپنی ہبہ کردہ چیز کا مطالبہ کرنا شرعاً مکروہ ہے؛ لیکن اگر قاضی واپسی کا فیصلہ کردے، یا موہوب لہ (ہبہ لینے والا) اپنی خوشی سے واپس کردے، تو لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (کتاب النوازل، ۱۲/ ۱۶۲)

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

باپ کی زندگی میں بیٹے کا حصہ طلب کرنا

سوال: اگر کوئی بیٹا اپنے باپ سے ان کی زندگی میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرے، تو اس کا مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: کسی بھی اولاد کو اپنے والد صاحب سے ان کی زندگی میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے؛ لیکن والد صاحب زندگی ہی میں اپنا مال بہ خوشی تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو اپنے سب لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر برابر حصہ دے کر قابض بنا دیں، اور اس میں سے جتنا چاہیں اپنے لئے روک لیں۔ (کتاب النوازل، ۱۲/۱۷۸)

شراب کی خالی بوتلوں کو فیکٹری پہنچانے کی اجرت

سوال: شراب کی خالی بوتلوں کو جمع کر کے لاریوں میں بھرنا اور اس کی اجرت لینا اور ان کے لئے مسلمانوں کا اپنی لاریاں استعمال کرنا اور ان کو فیکٹریوں تک لے جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: بوتلوں کو فیکٹری میں پہچانے کی اجرت لینا اور لاریوں کے ساتھ جا کر مال اتروانے کا معاوضہ لینا درست ہے، اور جو لوگ ان بوتلوں کو شراب کے لئے استعمال کریں اس کا گناہ انہی پر ہوگا، ٹرانسپوٹر اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ (کتاب النوازل ۱۲/۱۷۲)

پب جی (Pubg) گیم کھیلنا

سوال: پب جی (Pubg) گیم کھیلنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا اس کھیل کی وجہ سے آدمی ایمان سے محروم ہو جاتا ہے؟

جواب: پب جی گیم موبائیل اور انٹرنیٹ کے ذریعہ آپس میں رابطہ کر کے کھیلا جانے والا گیم ہے، جس کی بہت سی صورتیں مروج ہیں، اُن سب میں قدرے مشترک بات یہ ہے کہ یہ سراسر لہو ولعب اور وقت کا ضیاع ہے، اور زندگی کے قیمتی لمحات کو بے فائدہ ضائع کرنا ہے؛ اس لئے ہر مسلمان ایسے کھیلوں سے بہر حال دور رہنا چاہیئے۔

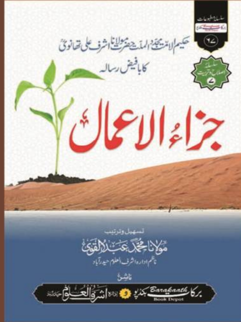
پھر اگر اس کھیل میں ہار جیت پر کھیلنے والوں کے درمیان بطور انعام پیسوں کا لین دین ہو، تو اس میں جوئے اور قمار کا پہلو بھی شامل ہو جائے گا، جو بہ جائے خود حرام ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بتایا کہ اس کھیل کی بعض صورتوں میں بتوں کی تعظیم کا پہلو بھی پایا جاتا ہے تو اگر یہ بات صحیح ہو تو جو شخص بھی بتوں کی تعظیم کا مرتکب ہوگا اُس کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔

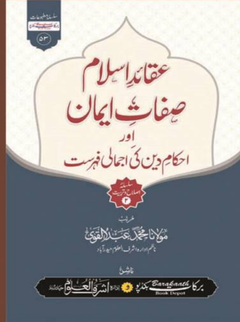
بہر صورت ایسے کھیلوں سے احتراز لازم ہے، اور شطرنج اور نردشیر جیسے کھیلوں کے بارے میں احادیث شریفہ میں جو وعیدیں وارد ہیں، اُن میں ''پب جی'' جیسے کھیل بھی ضرور شامل ہیں۔ (ماخوذ از: ارشاد السائلین: ۲/۵۵۳)

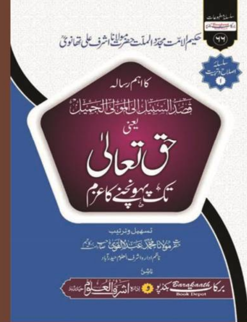
ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-

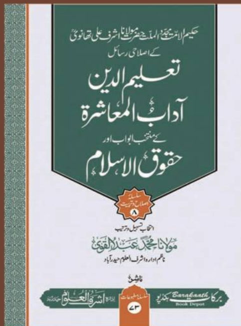
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: HSE/884/23-25

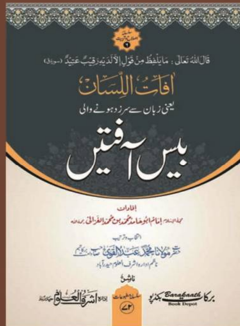
Date of Publication 3rd May-23, date of Posting 5th May-23

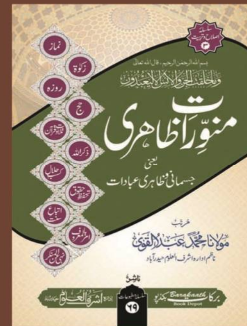


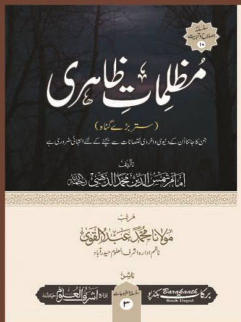


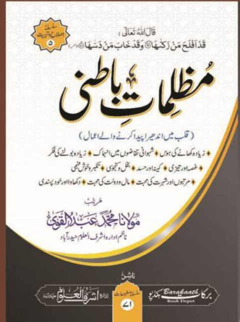


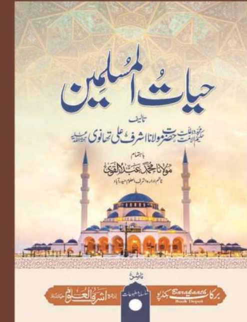












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059

Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059

Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Cellar Masjid-e-Meraj, Sayeedabad, Hyd-59